اسلام اور جدید معاشی نظریات

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)

طابع : ——— رانا اللہ داد خاں ، مینجنگ ڈائرکٹر

ناشر : ——— اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳، ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مطبع : ——— ماڈرن پرنٹرز، لاہور

اشاعت :

۱ تا ۱۹	دسمبر ۱۹۵۹ء تا اگست ۱۹۹۲ء	۲۸۱۰۰
۲۰	جنوری ۱۹۹۴ء	۱۱۰۰
۲۱	اکتوبر ۱۹۹۵ء	۱۱۰۰

قیمت : ۲۷/۰۰ روپے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

یہ مختصر رسالہ میری کتاب "سُود" کے ان ابواب کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے کتاب مذکور کے حصّۂ اوّل و دوم میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن حالات میں یہ دونوں حصّے مرتب ہوئے تھے ان کی وجہ سے اس کی ترتیب ناظرین کے ذہن کے لیے اچھی خاصی پریشان کن بن گئی تھی۔ اب از سرِ نو ترتیب کے موقع پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اس کے جن حصّوں کا تعلق براہِ راست سُود کے مسئلے سے نہیں ہے انہیں الگ کر کے ایک جُداگانہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا جائے، اور "سُود" کے عنوان سے صرف ان ابواب کو جمع کر دیا گیا جن میں براہِ راست مسئلہ سُود پر بحث کی گئی ہے۔

ابوالاعلیٰ

۲۰۔ ذی القعدہ سنہ ۱۳۷۴ھ (۹ جولائی سنہ ۱۹۵۵ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

موجودہ عمرانی مسائل کا تاریخی پس منظر

قریب کے زمانہ میں دنیا کی فکری امامت اور عملی تدبیر، دونوں ہی کا سررشتہ اہلِ مغرب کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس لیے بالکل ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر آج کی صورتِ حال یہ ہے کہ تمدن اور سیاست اور معیشت کے بارے میں ہمارے بیشتر مسائل اور ان مسائل میں ہماری الجھنیں ان حالات کی پیداوار ہیں جو مغربی زندگی میں انہی مسائل اور انہی الجھنوں کی پیدائش کے موجب ہوئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی اس امامت ہی کا ایک فطری اثر ہے کہ ہمارے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اکثریت ان مسائل کے حل کی انہی صورتوں میں اپنے لیے رہنمائی تلاش کر رہی ہے جو مغربی مدبرین و مفکرین نے پیش کی ہیں۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سب سے پہلے موجودہ عمرانی مسائل کے تاریخی پس پر ایک نگاہ ڈال لیں اور یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ان مسائل کے حل کی جو صورتیں آج تجویز یا اختیار کی جا رہی ہیں ان کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ اس تاریخی بیان کی روشنی میں وہ مباحث زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آ سکیں گے جن پر ہمیں اپنے موضوع کے سلسلہ میں گفتگو کرنی ہے۔

نظامِ جاگیرداری

پانچویں صدی عیسوی میں جب مغربی رومن امپائر کا نظام درہم برہم ہوا تو

یورپ کی تمدنی، سیاسی اور معاشی وحدت بالکل پارہ پارہ ہو گئی، جس رشتے نے مختلف قوموں اور ملکوں کو باہم مربوط کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا، اور جس انتظام نے اس ربط و تعلق کو ممکن بنا رکھا تھا وہ بھی قائم نہ رہا۔ اگرچہ رُومی قانون، رومی عالمگیریت، اور رومیوں کے سیاسی افکار کا ایک نقش تو اہلِ مغرب کے ذہن پر ضرور باقی رہ گیا جو آج تک موجود ہے، لیکن سلطنت کے ٹوٹنے سے سارا یورپ بے شمار چھوٹے چھوٹے اجزا میں بٹ گیا۔ ایک ایک جغرافی خطے کے کئی کئی ٹکڑے ہو گئے۔ کہیں کسی ایک نسل کے لوگ اور ایک زبان بولنے والے لوگ بھی اپنی کوئی وحدت قائم نہ رکھ سکے۔ ساری مملکت تقسیم در تقسیم ہو کر ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں متفرق ہو گئی جن کا انتظام مقامی رئیس اور جاگیردار سنبھال سکتے تھے۔ اس طرح یورپ میں اِس نظامِ زندگی کا آغاز ہُوا جس کو اصطلاحاً "نظامِ جاگیرداری" (Feudal System) کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں بتدریج جو جو خصوصیات پیدا ہوئیں اور آگے چل کر سختی کے ساتھ مستحکم ہوتی چلی گئیں وہ یہ تھیں:

۱۔ بنائے اقتدار ملکیتِ زمین قرار پائی۔ عزت، طاقت، بالادستی اور مستقل حقوق صرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص ہو گئے جو کسی علاقے میں مالکانِ زمین ہوں۔ وہی اپنے علاقے میں امن قائم کرتے تھے۔ انہی سے رئیس یا جاگیردار یا بادشاہ کا براہِ راست تعلق ہوتا تھا۔ انہی کی سرپرستی میں علاقے کے وہ سب لوگ زندگی بسر کرتے تھے جو مالکانِ زمین کے طبقے سے تعلق نہ رکھتے ہوں، خواہ وہ مزارعین ہوں یا اہلِ حرفہ یا اہلِ تجارت۔ یہ سب گویا رعیت تھے۔ پھر خود اس

رعیت میں بھی بہت سے طبقات تھے جن میں سے کوئی اونچا تھا اور کوئی نیچا۔ یہ طبقاتی تقسیم اور اس تقسیم کی بنا پر مراتب اور حیثیات اور حقوق کی تفریق اس سوسائٹی میں گہری جڑوں کے ساتھ جم گئی تھی۔ اس طرح نظام جاگیرداری کا معاشرہ ایک زینے کی سی شکل اختیار کر گیا تھا جس کی ہر سیڑھی پر بیٹھنے والا اپنے سے نیچے والے کا خدا اور اپنے سے اوپر والے کا بندہ بنا ہوا تھا۔ اس میں سب سے اُوپر علاقے کے والئ ریاست کا خاندان ہوتا تھا اور سب سے نیچے وہ غریب خاندان ہوتے تھے جو کسی پر بھی اپنی خدائی کا زور نہ چلا سکتے تھے۔

۲۔ مسیحی کلیسا جو خدا کے نام پر لوگوں سے بات کرتا تھا، مگر جس کے پاس فی الحقیقت کوئی خدائی قانون اور کوئی اصولی ہدایت نامہ موجود نہ تھا، اُس وقت یورپ میں نیا نیا قائم ہوا تھا۔ اس نے اس تو خیز نظام جاگیرداری سے موافقت کر لی اور وہ اُن تمام روایتی اداروں اور حقوق اور امتیازات اور پابندیوں کو مذہبی سند عطا کرتا چلا گیا جو اس نظام کے ساتھ ساتھ معاشرے میں جڑ پکڑ رہے تھے۔ ہر خیال جو پُرانا ہو گیا، کلیسا کا عقیدہ بن گیا اور اس کے خلاف کچھ سوچنا کفر قرار پایا۔ ہر رسم جو ایک دفعہ پڑ گئی، شریعت بن کر رہ گئی اور اس سے انحراف کے معنی خدا اور اس کے دین سے انحراف کے ہو گئے۔ ادب و فلسفہ ہو یا معاشرت اور سیاست اور معیشت، جس چیز کی بھی جو شکل نظام جاگیرداری میں قائم ہوئی تھی کلیسا نے اس کو خدا کی دی ہوئی شکل ٹھہرا دیا اور اس بنا پر اس کو بدلنے کی کوشش جرم ہی نہیں، حرام بھی ہو گئی۔

۳۔ چونکہ کوئی ایسا مرکزی اقتدار اور انتظام موجود نہ تھا جو بڑی بڑی

شاہراہوں کو تعمیر کرنا اور انھیں درست حالت میں رکھنا اور اُن پر امن قائم کرنا، اس لیے دُور دراز کے سفر، اور بڑے پیمانے پر تجارت، اور کثیر مقدار میں اشیاءِ ضرورت کی تیاری اور کھپت، غرض اس قسم کی ساری سرگرمیاں بند ہو گئیں اور تجارتیں، صنعتیں اور ذہنیتیں، سب ان چھوٹے چھوٹے جغرافی خطّوں میں سکڑ کر رہ گئیں جن کے حدُود اربعہ جاگیرداروں کے اقتدار نے کھینچ رکھے تھے۔

یہ صنعت اور تجارت کا ایک ایک شعبہ ایک ایک کاروباری اور پیشہ ور برادری کا اجارہ بن گیا۔ نہ برادری کا کوئی آدمی اپنے پیشے سے نکل سکتا تھا اور نہ کوئی بیرونی آدمی کسی پیشے میں داخل ہو سکتا تھا۔ ہر برادری اپنے کام کو اپنے ہی حلقے میں محدُود رکھنے پر مُصر تھی۔ مال فوری اور مقامی ضروریات کے لیے تیار ہوتا، آس پاس کے علاقوں ہی میں کھپ جاتا، اور زیادہ تر اجناس کے بدلے اس کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ ان مختلف اسباب نے ترقی، توسیع، ایجاد، فنی اصلاح، اور اجتماعِ سرمایہ کا دروازہ تقریباً بند کر رکھا تھا۔

ان خرابیوں کو جو رومن امپائر کے زوال و سقوط سے پیدا ہوئی تھیں، ہولی رومن امپائر کے قیام نے کچھ بھی دُور نہ کیا۔ پوپ اور قیصر نے چاہے روحانی و اخلاقی اور کسی حد تک سیاسی حیثیت سے پھر ایک رشتۂ وحدت یورپ کو بہم پہنچا دیا ہو، لیکن جاگیرداری نظام میں تمدن و معاشرت اور معیشت کی جو صورت بن چکی تھی وہ نہ صرف یہ کہ بدلی نہیں، بلکہ ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی کہ اس کے سوا انتظامِ زندگی کی کوئی دُوسری صورت گویا سوچی ہی نہ جا سکتی تھی۔

نشأۃ ثانیہ

اس جمود کے ٹوٹنے کی ابتدا کس طرح، کن اسباب سے ہوئی اور کس طرح یورپ میں وہ ہمہ گیر تحریک اٹھی جو نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے نام سے مشہور ہے، یہ بحث ہمارے موضوع سے بہت ہٹی ہوئی ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ایک طرف ہسپانیہ اور صقلیہ پر مسلمانوں کے قبضے نے اور دوسری طرف صلیبی لڑائیوں نے اہلِ مغرب کو دنیا کی ان قوموں سے دوچار کیا جو اس وقت تہذیب و تمدن کی علمبردار تھیں۔ اگرچہ تعصب کے اُس پردے نے جو کلیسا کے اثر سے اہلِ مغرب کی آنکھوں پر پڑا ہوا تھا، ان لوگوں کو براہِ راست اسلام کی طرف تو متوجہ نہ ہونے دیا لیکن مسلمانوں سے جو سابقہ ان کو پیش آیا اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ خیالات، معلومات اور ترقی یافتہ طریقوں کی ایک وسیع دولت ان کے ہاتھ آئی اور وہی آخرکار ایک نئے دَور کے آغاز کی موجب ہوئی۔

چودھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی تک کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں دَورِ متوسط سے دورِ جدید کی طرف عبور کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں مغربی زندگی کا ہر پہلو اُن اثرات کی وجہ سے حرکت میں آگیا جو بیرونی دُنیا سے درآمد ہو رہے تھے۔ طبعیات، طب، ریاضی، انجینئرنگ اور دوسرے شعبوں میں اہلِ مغرب کا علم بڑھنا شروع ہوا۔ پریس کی ایجاد نے اشاعتِ خیالات اور اشاعتِ علم کی رفتار تیز کر دی۔ علمی بیداری کے ساتھ لازماً ہر شعبۂ حیات میں تنقید و اصلاح کا سلسلہ چل پڑا۔ نئے فنون کی واقفیت نے صنعت، زراعت، تجارت اور عام طور پر پورے تمدن میں جان ڈال دی۔ پھر نئی جغرافی دریافتوں سے فکر و نظر میں بھی وسعت پیدا ہونے لگی اور اس کے ساتھ اہلِ مغرب کے لیے دُور دراز کے ملکوں

میں ایسی منڈیاں بھی کھلنی شروع ہو گئیں جہاں وہ اپنے ملک کی مصنوعات اور خام پیداوار نکال سکیں اور دوسرے ملکوں کی مصنوعات اور خام پیداوار خرید سکیں۔ ان مواقع سے تجارت کا وہ بازار جو صدیوں سے سرد پڑا ہوا تھا، از سرِ نو گرم ہونے لگا۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود یورپ کے اندر بھی اور باہر بھی سوداگروں کا کاروبار پھیلنا شروع ہوا۔ بڑے بڑے تجارتی چوراہوں پر شہر بستے اور بڑھتے چلے گئے۔ دولت، طاقت، ذہانت، تہذیب اور تمدن کا مرکز بتدریج جاگیروں اور ریاستوں کے قصباتی صدر مقامات سے ہٹ کر ان کے بڑے بڑے شہروں کی طرف سرکنے لگا۔ جو تجارت اور صنعت اور جدید علمی و ادبی حرکت کے مرکز بن رہے تھے۔

اس نئی حرکت کے میرِ کارواں وہ "بورژوا" طبقہ کے لوگ (یعنی سوداگر، ساہوکار، اہلِ حرفہ اور بحری تجار وغیرہ) تھے جو ترقی کے ان مواقع سے مستفید ہو رہے تھے، شہروں میں آباد تھے یا بکثرت آمد و رفت رکھتے تھے یا کم از کم باہر سے آنے والے اثرات کی زد میں تھے۔ ان کے اندر تغیر اور ترقی کی ایک لگن پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن ان لوگوں کے اُبھرنے اور آگے بڑھنے میں ہر طرف سے ان فکری، اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اور سیاسی و معاشی بندشوں نے سخت رکاوٹیں عائد کر رکھی تھیں جو کلیسا اور جاگیرداری کے گٹھ جوڑ سے قائم ہوئی تھیں۔ زندگی کے جس شعبے میں بھی یہ لوگ صدیوں کے بنے اور جمے ہوئے دائروں سے قدم باہر نکالتے، پادری اور جاگیردار، دونوں مل کر ان کا راستہ روک لیتے تھے۔ اس بنا پر ان دونوں طاقتوں کے خلاف ایک ہمہ گیر کشمکش کا آغاز ہوا اور ایک جنگ سی چھڑ گئی... ہر میدان میں چھڑ گئی۔ علم و ادب کے میدان میں کلیسا کے

عائد کردہ ذہنی استبداد کو چیلنج کیا گیا اور آزادیٔ فکر و تحقیق پر زور دیا گیا معیشت اور معاشرت اور سیاست کے میدان میں جاگیرداروں کے اقتدار کو چیلنج کیا گیا اور ان سارے امتیازات کے خلاف آواز اٹھائی گئی جو نظام جاگیرداری کے تحت قائم تھے۔ آہستہ آہستہ یہ جنگ پرانے نظام کی پسپائی اور ان نوخیز طاقتوں کی پیش قدمی پر منتج ہوتی چلی گئی اور سولھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ یورپ کے مختلف ملکوں میں چھوٹی چھوٹی جاگیرداریاں ٹوٹ ٹوٹ کر بڑی بڑی قومی ریاستوں میں جذب ہونے لگیں، یورپ کے روحانی تسلط کا طلسم ٹوٹ گیا۔ نئی قومی ریاستوں کے غیر مذہبی حکمرانوں نے کلیسا کی املاک ضبط کرنی شروع کر دیں، ایک عالمگیر مذہبی نظام کو چھوڑ کر مختلف قوموں نے اپنے اپنے الگ قومی کلیسا بنانے شروع کر دیئے جو قومی ریاستوں کے حریف یا شریک و سہیم ہونے کے بجائے اُن کے دست نگر تھے، اور اس طرح چرچ اور جاگیرداری کے مشترک غلبے کی بندشیں ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ "بورژوا" طبقہ ان معاشرتی اور روایتی رکاوٹوں سے آزاد ہوتا چلا گیا۔ جو اس پرانے نظام نے اس کی راہ میں حائل کر رکھی تھیں۔

دورِ متوسط کا لبرلزم

کلیسا اور جاگیرداری کے خلاف یہ جنگ جن نظریات کی بنا پر لڑی گئی ان کا سرِ عنوان تھا "لبرلزم" یعنی "وسیع المشربی"۔ نئے دور کے علمبردار زندگی کے ہر شعبے اور فکر و عمل کے ہر میدان میں وسعت مشرب، فیاضی، فراخ دلی اور کشادگی کا وعظ کہتے تھے، عام اس سے کہ وہ مذہب اور فلسفے اور علم و فن

کے میدان ہوں، یا معاشرت اور تمدن اور سیاست اور معیشت کے میدان۔ وہ ترقی پسند انسان کے راستے سے ہر طرف بندشوں اور رکاوٹوں اور تنگیوں اور سختیوں کو دُور کر دینا چاہتے تھے۔

اس کشمکش میں اگر اہلِ کلیسا اور جاگیرداروں کی تنگ خیالی ایک انتہا پر تھی تو ان بورژوا حضرات کی وسعتِ مشرب دوسری انتہا کی طرف چلی جارہی تھی۔ دونوں طرف خود غرضیاں کارفرما تھیں۔ حق اور انصاف اور علمِ صحیح اور فکرِ صالح سے دونوں کو کچھ واسطہ نہ تھا۔ ایک گروہ نے اگر بیجا اصل عقائد، ناروا امتیازات اور زبردستی کے قائم کردہ حقوق کی مدافعت میں خدا اور دین اور اخلاق کا نام استعمال کیا، تو دُوسرے گروہ نے اس کی ضد میں آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے نام سے مذہب و اخلاق کی ان صداقتوں کو بھی متزلزل کرنا شروع کر دیا جو ہمیشہ سے مسلّم چلی آرہی تھیں۔ یہی زمانہ تھا جس میں سیاست کا رشتہ اخلاق سے توڑا گیا اور میکیاویلی نے کھلم کھلا اس نظریہ کی وکالت کی کہ سیاسی اغراض و مصالح کے معاملہ میں اخلاقی اصولوں کا لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہی زمانہ تھا جس میں کلیسا اور جاگیرداری کے بالمقابل قومیت اور قوم پرستی اور قومی ریاست کے بُت تراشے گئے۔ اور اس فتنے کی بنا ڈالی گئی جس کی بدولت آج دنیا لڑائیوں اور قومی عداوتوں کا ایک کرہ آتش فشاں بنی ہوئی ہے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جس میں پہلی مرتبہ سُود کے جائز و مباح ہونے کا تخیل پیدا ہُوا، حالانکہ قدیم ترین زمانے سے تمام دنیا کے اہلِ دین و اخلاق اور علماء قانون اس چیز کی حرمت پر متفق تھے۔ صرف توراۃ اور قرآن ہی نے اس کو

حرام نہیں ٹھہرایا تھا بلکہ ارسطو اور افلاطون بھی اس کی حرمت کے قائل تھے۔ یونان اور روم کے قوانین میں بھی یہ چیز ممنوع تھی۔ لیکن نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب بورژوا طبقہ نے مسیحی کلیسا کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تو پہلے سود کو ایک ناگزیر برائی کہنا شروع کیا گیا۔ یہاں تک کہ اس پرزور پروپیگنڈا سے مرعوب ہو کر مسیحی متجددین (Reformists) بھی اس کو انسانی کمزوری کے عذر کی بنا پر "اضطراراً" جائز ٹھہرانے لگے، پھر رفتہ رفتہ ساری اخلاقی گفتگو صرف شرح سود پر مرکوز ہو گئی اور ممتاز اہلِ فکر اپنا سارا زور اس بحث پر صرف کرنے لگے کہ سود کی شرح "معقول" ہونی چاہیے، اور آخر کار یہ تخیل جڑ پکڑ گیا کہ مذہب و اخلاق کو کاروباری معاملات سے کیا غرض۔ معاشی حیثیت سے سود سراسر ایک فطری اور معقول چیز ہے، جس طرح کرایہ مکان کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا اسی طرح سود کے خلاف بھی کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ہے!

لطف یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ ہی کے دور میں اس بورژوا طبقے نے اپنی اس وسیع المشربی کا صور پھونک پھونک کر پادریوں اور جاگیرداروں اور مالکانِ زمین کے قبضے سے جتنا میدان نکالا اس کے وہ تنہا خود ہی حقدار بنتے چلے گئے۔ ان کی وسیع المشربی نے ان کو یہ یاد نہ دلایا کہ ان سے فروتر ایک اور طبقہ عوام الناس کا بھی موجود ہے جو جاگیرداری نظام میں ان کی بہ نسبت زیادہ مظلوم تھا اور اب اس لبرل نظام کے فوائد میں سے وہ بھی حصہ پانے کا حق رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر جب انگلستان میں پارلیمنٹری طرزِ حکومت کی بنا پڑی اور پارلیمنٹ میں اصل اقتدار امراء (لارڈس) کے ہاتھ سے نکل کر "عوام" (کامنز) کے ہاتھ

میں آیا تو اس سارے اقتدار کو ان وسیع المشرب بورژوا حضرات ہی نے اُچک لیا۔ جن دلائل سے انھوں نے اپنے لیے ووٹ کا حق حاصل کیا تھا وہ دلائل نچلے طبقے کے عوام کو ووٹ کا حق دینے سے انکار کرتے وقت ان کو یاد نہ آئے۔

صنعتی انقلاب

اٹھارویں صدی عیسوی میں مشین کی ایجاد نے اس انقلاب کی رفتار کو بدرجہا زیادہ تیز کر دیا۔ جس کی ابتدا نشاۃ ثانیہ کے دور میں ہوئی تھی۔ نئی سائنٹفک معلومات اور ایجادات کو جب صنعت و حرفت، زراعت اور وسائل آمد و رفت کی ترقی میں استعمال کیا گیا تو اتنے بڑے پیمانے پر مصنوعات کی تیاری، خام پیداوار کی فراہمی اور دنیا کے گوشے گوشے میں تیار مال کی کھپت کا سلسلہ چل پڑا جس کا تصور بھی اس سے پہلے کبھی نہ کیا گیا تھا۔

اس عظیم الشان انقلاب نے ترقی، خوشحالی اور قوت و اقتدار کے جن مواقع کا دروازہ کھولا ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے قریب ترین گروہ اگر کوئی تھا تو وہی "بورژوا" گروہ تھا جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں اُبھر آیا تھا۔ کیونکہ صنعت و تجارت اسی کے ہاتھ میں تھی، سرمایہ بھی اسی کے پاس تھا، اور علم و ادب پر بھی وہی چھایا ہوا تھا۔ اس نے سرمایہ اور فنی قابلیت اور تنظیمی صلاحیت، تینوں کے اشتراک سے صنعت اور کاروبار کا ایک نیا نظام بنا کھڑا کیا جسے "جدید نظام سرمایہ داری" کہا جاتا ہے۔ اس نظام کے تحت شہروں میں بڑے بڑے کارخانے اور تجارتی ادارے قائم ہوئے۔ پیشہ ور برادریوں کے پرانے حلقے ٹوٹ گئے۔ چھوٹے چھوٹے کارخانوں اور منفرد کاریگروں اور چھوٹی پونجی والے کاندارو

نکے لیے دائرہ زندگی تنگ ہو گیا۔ دیہات و قصبات کے پیشہ ور لوگ مجبور ہو گئے
شہروں میں آئیں اور ان بڑے کارخانہ داروں کے دروازے پر مزدوری کی حیثیت
سے جا کھڑے ہوں اور چھوٹے موٹے سوداگر اور کاروباری لوگ بھی مجبور ہو گئے
کہ ان بڑے صناعوں اور تاجروں کی ملازمت یا ایجنسی قبول کر لیں۔ اسی طرح
سائنس کی نئی دریافتوں سے جو طاقت آئی تھی اُسے بورژوا طبقے نے اُچک لیا
اور اپنی فتوحات کا دائرہ پھیلانا شروع کر دیا۔

اس دائرے کے پھیلاؤ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ قومی ریاستیں تھیں جو
نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھیں ان ریاستوں کے مطلق العنان
بادشاہ "خدا داد حق" کے مدعی تھے۔ سابق جاگیرداری نظام کے اُمراء ان بادشاہوں
کی "پائیگاہ" بن گئے تھے اور قومی کلیسا ان کے لیے مذہبی و روحانی پشت پناہ
تھے۔ سارا سیاسی اقتدار اسی تثلیث کے قبضے میں تھا، اور بورژوا طبقے کے لیے
اس تثلیث کی فرمانروائی طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتی تھی۔ اس کی ڈالی ہوئی
رکاوٹیں نہ صرف صنعت اور تجارت کے میدان میں اس طبقے کی پیش قدمی کو
روکتی تھیں، بلکہ تمدن اور معاشرت میں بھی دورِ جاگیرداری کے وہ بہت سے
باقیات ابھی موجود تھے جو اس نوخیز طبقے کو ناگوار تھے۔

جدید لبرلزم

اس دور میں وہی "لبرلزم" جس نے پچھلی لڑائی جیتی تھی نئے ہتھیاروں
سے مسلح ہو کر اُٹھا اور اس نے سیاسیات میں جمہوریت کا تمدن و معاشرت
اور اخلاق میں انفرادی آزادی کا اور معاشیات میں بے قیدی (Laissez Faire Policy) کا

کا صور پھونکنا شروع کیا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ چرچ ہو، یا اسٹیٹ یا سوسائٹی،
کسی کو بھی فرد کی سعیِ ارتقاء اور سعیِ انتفاع میں رکاوٹیں عائد کرنے کا حق نہیں ہے۔
ہر شخص کو بالکل آزادی کے ساتھ یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ اپنی قوتوں اور
قابلیتوں کو اپنے رُجحانات کے مطابق استعمال کرے۔ اور جتنا آگے بڑھ سکتا
ہے بڑھتا چلا جائے۔ خود سوسائٹی کے مفاد کی بھی بہترین خدمت اسی طرح ہو
سکتی ہے کہ اس کے ہر فرد کو غیر محدود آزادی حاصل ہو۔ ہر شعبۂ حیات اور ہر
راہِ عمل میں مکمل آزادی۔ ہر خارجی رکاوٹ سے، ہر بیرونی قید سے، ہر مذہبی و
اخلاقی تہدید سے اور ہر قانونی یا اجتماعی مداخلت سے پوری آزادی۔

اس طرح اس نظریہ کے حامیوں نے ہر طرف رواداری، بے قیدی،
اباحیت، انفرادیت اور فقتہ مختصر یہ کہ اپنی اصطلاح خاص میں "معقولیت"
کو برسرِکار لانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

سیاسیات میں ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کے اختیارات کم سے کم
ہوں اور فرد کی آزادی کے حدود زیادہ سے زیادہ۔ حکومت صرف ایک
عدل قائم کرنے والی ایجنسی ہو جو افراد کو ایک دوسرے کے حدود میں دخل
انداز ہونے سے روکتی رہے اور انفرادی آزادی کی حفاظت کرے۔ باقی
رہی تمدنی و معاشی زندگی، تو اس کا سارا کاروبار افراد کی آزادانہ سعی و عمل اور
فکر و تدبر کے بل پر چلنا چاہیے۔ اس میں حکومت کو نہ عامل کی حیثیت ہی سے دخل
دینے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ رہنما ہی کی حیثیت سے۔ اس کے ساتھ سیاسیات
میں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ حکمرانی کا اقتدار نہ تو کسی شاہی خاندان کی ملک ہے

اور نہ چند زمیندار گھرانوں کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ ملک عام باشندوں کا ہے۔ حکومت کا سارا کاروبار انہی کے دیئے ہوئے ٹیکسوں سے چلتا ہے۔ لہٰذا انہی کی رائے سے حکومتیں بننی اور ٹوٹنی اور بدلنی چاہییں اور انہی کی آواز کو قانون سازی اور نظم ونسق میں فیصلہ کن اثر حاصل ہونا چاہیے۔ یہی نظریات ان جدید جمہوریتوں کی بنیاد بنے جو اٹھارویں صدی کے آخر سے دنیا میں قائم ہونی شروع ہوئیں۔

معاشیات میں جس اصول پر انھوں نے زور دیا وہ یہ تھا کہ اگر فطری قوانین معیشت کو خارجی مداخلت اور خلل اندازی کے بغیر خود کام کرنے دیا جائے تو افراد کی انفرادی کوششوں سے آپ ہی آپ اجتماعی فلاح کی بڑی سے بڑی خدمت انجام پاتی چلی جائے گی۔ پیداوار زیادہ سے زیادہ ہوگی اور اس کی تقسیم بھی بہتر سے بہتر طریقہ پر ہوتی رہے گی۔ بشرطیکہ لوگوں کو سعی وعمل کی آزادی حاصل رہے اور حکومت اس فطری عمل میں مصنوعی طور پر مداخلت نہ کرے۔ بے قید معیشت کا یہی اصول (Free Enterprise) جدید نظام سرمایہ داری کا بنیادی فارمولا قرار پایا۔

اس میں شک نہیں کہ نشاۃ جدیدہ کے دور کی وسیع المشربی کی طرح یہ صنعتی انقلاب کے دور کی وسیع المشربی بھی اپنے اندر صداقت کے کچھ عناصر رکھتی تھی اور یہی عناصر آخرکار اس کی فتح یابی کے موجب ہوئے لیکن یہاں پھر مغربی ذہن کی وہی دو بنیادی کمزوریاں اس صداقت کے ساتھ لگی ہوئی تھیں جن کو پاپائی و جاگیرداری کے دور سے ہم برابر کارفرما دیکھتے چلے آرہے ہیں یعنی خودغرضی اور انتہاپسندی۔

خودغرضی کا کرشمہ یہ تھا کہ ان میں سے اکثر کے مطالبۂ حق وانصاف میں کوئی خلوص نہ تھا۔ جو صحیح اصول وہ پیش کرتے تھے ان کی اصل محرک حق پسندی نہ تھی بلکہ صرف یہ بات تھی کہ وہ ان کی اغراض کے لیے مفید تھے اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ جن حقوق کا خود اپنے لیے مطالبہ کرتے تھے وہی حقوق اپنے مزدوروں اور نادار عوام کو دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

رہی انتہا پسندی، تو وہ ان کے مخلص اہلِ علم اور اہلِ قلم حضرات کی بات بات میں نمایاں تھی۔ چند صداقتوں کو انھوں نے لیا اور انھیں ان کی حد سے بہت زیادہ بڑھا دیا۔ چند دوسری صداقتوں کو انھوں نے نظر انداز کر دیا۔ اور زندگی میں جو مقام ان کے لیے تھا اس میں بھی اپنی منظورِ نظر صداقتوں کو لا بٹھایا حالانکہ ہر صداقت اپنی حد سے نکل جانے کے بعد جھوٹ بن جاتی ہے اور اُلٹے نتائج دکھلانے لگتی ہے۔ یہ افراط و تفریط اس نظامِ حیات کے سارے ہی گوشوں میں پائی جاتی ہے جو "بے قیدی"، "انفرادیت"، اور "جمہوریت" کے ان نظریات کے زیرِ اثر مرتب ہوا۔ لیکن اس وقت ہمارا موضوع چونکہ خاص طور پر معیشت کا گوشہ ہے، اس لیے ہم دوسرے گوشوں کو چھوڑتے ہوئے صرف اسی گوشے کا جائزہ لے کر یہ دکھائیں گے کہ فطری قوانینِ معیشت کے ساتھ خودغرضی اور انتہا پسندی کی آمیزش سے کس قسم کا غیر متوازن نظامِ معاشی ان لوگوں نے بنایا اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

جدید نظامِ سرمایہ داری

جیساکہ ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں، بے قید معیشت کے "وسیع المشرب" نظریہ پر جس معاشی نظام کی عمارت اٹھی اس کا نام اصطلاح میں "جدید نظامِ سرمایہ داری" (Modern Capitalism) ہے۔

بے قید معیشت کے اصوُل

اس نظام کے بنیادی اصول حسبِ ذیل ہیں:۔

ا۔ شخصی ملکیّت کا حق۔ صرف انہی اشیاء کی ملکیت کا حق نہیں جنہیں آدمی خود استعمال کرتا ہے، مثلاً کپڑے، برتن، فرنیچر، مکان، سواری، مویشی وغیرہ۔ بلکہ ان اشیاء کی ملکیت کا حق بھی جن سے آدمی مختلف قسم کی اشیاءِ ضرورت پیدا کرتا ہے تاکہ انھیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کرے، مثلاً مشین، آلات، زمین، خام مواد وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں پر تو بلا نزاع ہر نظام میں انفرادی حقوقِ ملکیت تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن بحث دوسری قسم کی اشیاء یعنی ذرائعِ پیداوار کے معاملہ میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے کہ آیا ان پر بھی انفرادی ملکیّت کا حق جائز ہے یا نہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کی اوّلین امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس حق کو تسلیم کرتا ہے بلکہ درحقیقت یہی حق اس نظام کا سنگِ بنیاد ہے۔

۲۔ آزادیٔ سعی کا حق: یعنی افراد کا یہ حق کہ وہ فرداً فرداً، یا چھوٹے بڑے گروہوں کی شکل میں مل کر اپنے ذرائع کو جس میدانِ عمل میں چاہیں استعمال کریں۔ اس کوشش کے نتیجہ میں جو فوائد حاصل ہوں، یا جو نقصانات پہنچیں، دونوں انہی کے لیے ہیں۔ نقصان کا خطرہ بھی وہ خود ہی برداشت کریں گے، اور ان کے فائدے پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ ان کو پوری آزادی ہے کہ اپنی پیداوار اور اشیاء کی تیاری کو جس قدر چاہیں بڑھائیں یا گھٹائیں، اپنے مال کی جو قیمت چاہیں رکھیں جتنے آدمیوں سے چاہیں، اُجرت پر یا تنخواہ پر کام لیں، اپنے کاروبار کے سلسلے میں جو شرائط اور جو ذمہ داریاں چاہیں قبول کریں اور جو ضابطے چاہیں بنائیں۔ بائع اور مشتری، اجیر اور مستاجر، مالک اور نوکر کے درمیان کاروبار کی حد تک سارے معاملات آزادانہ طے ہونے چاہییں، اور جن شرائط پر بھی ان کی باہمی قرارداد ہو جائے اسے نافذ ہونا چاہیے۔

۳۔ ذاتی نفع کا محرک عمل ہونا۔ نظام سرمایہ داری اشیاءِ ضرورت کی پیداوار ترقی کے لیے جس چیز پر انحصار کرتا ہے وہ فائدے کی طمع اور نفع کی امید ہے جو ہر انسان کے اندر فطرۃً موجود ہے اور اس کو سعی و عمل پر اُبھارتی ہے۔ نظام سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ انسانی زندگی میں اس سے بہتر بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا محرک عمل فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نفع کے امکانات جس قدر کم کر دیں گے اسی قدر آدمی کی جدوجہد اور محنت کم ہو جائے گی نفع کے امکانات کھلے رکھیے اور ہر شخص کو موقع دیجیے کہ اپنی محنت و قابلیت سے جتنا کما سکتا ہے کمائے۔ ہر شخص خود زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کام کرنے

کی کوشش کرنے لگے گا۔ اس طرح آپ سے آپ پیداوار بڑھے گی، اس کا معیار
بھی بلند ہوتا چلا جائے گا، تمام ممکن ذرائع و وسائل استعمال میں آتے چلے جائیں گے،
اشیاء ضرورت کی بہم رسانی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا اور ذاتی
نفع کا لالچ افراد سے اجتماعی مفاد کی وہ خدمت خود ہی لے لے گا جو کسی دوسری
طرح ان سے نہیں لی جا سکتی۔

۴۔ مقابلہ اور مسابقت۔ نظام سرمایہ داری کے وکلا کہتے ہیں کہ یہی
وہ چیز ہے جو بے قید معیشت میں افراد کی خود غرضی کو بے جا حد تک بڑھنے سے
روکتی ہے اور ان کے درمیان اعتدال و توازن قائم کرتی رہتی ہے۔ یہ انتظام
فطرت نے خود ہی کر دیا ہے۔ کھلے بازار میں جب ایک ہی جنس کے بہت سے تیار
کرنے والے، بہت سے سوداگر اور بہت سے خریدار ہوتے ہیں تو مقابلے میں آکر
کسر و انکسار سے خود ہی قیمتوں کا ایک مناسب معیار قائم ہو جاتا ہے اور نفع
اندوزی نہ مستقل طور پر حد سے بڑھنے پاتی ہے نہ حد سے گھٹ سکتی ہے۔ اتفاقی
اتار چڑھاؤ کی بات دوسری ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس کام کرنے والے اور کام لینے
والے بھی اپنی اپنی جگہ مقابلے کی بدولت خود ہی اجرتوں اور تنخواہوں کے متوازن
معیار قائم کرتے رہتے ہیں بشرطیکہ مقابلہ کھلا اور آزاد نہ ہو، کسی قسم کی اجارہ
داریوں سے اس کو تنگ نہ کر دیا جائے۔

۵۔ اجیر اور مستاجر کے حقوق کا فرق۔ نظام سرمایہ داری میں ہر کاروباری
ادارے کے کارکن دو فریقوں پر منقسم ہوتے ہیں۔ ایک مالک، جو اپنی ذمہ داری
پر کسی تجارت یا صنعت کو شروع کرتے ہیں اور چلاتے ہیں اور آخر تک اس کے

نفع ونقصان کے ذمہ دار رہتے ہیں۔ دُوسرے مزدُور یا ملازم جن کو نفع ونقصان سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، وہ بس اپنا وقت اور اپنی محنت وقابلیت اس کاروبار میں صرف کرتے ہیں اور اس کی ایک طے شدہ اُجرت لے لیتے ہیں۔
بسا اوقات کاروبار میں مسلسل گھاٹا آتا رہتا ہے مگر اجیر اپنی اُجرت لیے جاتا ہے۔ بسا اوقات کاروبار بالکل بیٹھ جاتا ہے جس میں مالک تو بالکل برباد ہو جاتا ہے مگر اجیر کے لیے بس اتنا فرق پڑتا ہے کہ آج اس دکان یا کارخانے میں کام کر رہا تھا تو کل دوسری جگہ جا کھڑا ہوا۔ نظام سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ معاملہ کی یہ نوعیت آپ ہی یہ بات طے کر دیتی ہے کہ از روئے انصاف کاروبار کا منافع اس کا حصہ ہے جس کے حصے میں کاروبار کا نقصان آتا ہے اور جو کاروبار کا خطرہ مول لیتا ہے۔ رہا اجیر تو وہ اپنی مناسب اُجرت لینے کا حق دار ہے جو معروف طریقہ پر اس کے کام کی نوعیت اور مقدار کے لحاظ سے مارکیٹ کی شرح کے مطابق طے ہو جاتے۔ اِس اُجرت کو نہ تو اس دلیل کی بنا پر بڑھنا ہی چاہیے کہ کاروبار میں منافع ہو رہا ہے اور نہ اس دلیل سے گھٹنا چاہیے کہ کاروبار میں گھاٹا آرہا ہے۔ اجیر کا کام اس کی طے شدہ اُجرت کا بہر حال مستحق بناتا ہے اور بس طے شدہ اُجرت ہی کا مستحق بناتا ہے۔ اِن اُجرتوں میں کمی بیشی اگر ہوگی تو اسی فطری قانون کے تحت ہوتی رہے گی جس کے تحت دوسری تمام اشیاء کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ کام لینے والے کم اور کام کے خواہش مند زیادہ ہوں گے تو اُجرتیں آپ سے آپ کم ہوں گی۔ کام کرنے والے کم اور کام لینے والے زیادہ

ہوں گے تو اُجرتیں خود بڑھ جائیں گی۔ اچھے اور ہوشیار کارکن کا کام آپ سے آپ زیادہ اُجرت لائے گا اور کاروبار کا مالک خود اپنے ہی فائدے کی خاطر اس کو انعام اور ترقی دے دے کر خوش کرتا رہے گا۔ خود کارکن بھی جیسی کچھ اُجرت پائے گا ویسی ہی وہ کاروبار کی ترقی و بہتری میں جان لڑائے گا۔ مالکوں کی خواہش فطرۃً یہ ہوگی کہ لاگت کم سے کم اور منافع زیادہ سے زیادہ ہو، اس لیے وہ اُجرتیں کم رکھنے پر مائل ہوں گے۔ کارکن فطرۃً یہ چاہیں گے کہ ان کی ضروریات زیادہ سے زیادہ فراغت کے ساتھ پوری ہوں اور ان کا معیارِ زندگی بھی کچھ نہ کچھ بلند ہوتا رہے، اس لیے وہ ہمیشہ اُجرتیں بڑھوانے کے خواہشمند رہیں گے۔ اس تضاد سے ایک گونہ کشمکش پیدا ہونی ایک قدرتی بات ہے لیکن جس طرح دنیا کے ہر معاملہ میں ہوا کرتا ہے، اس معاملہ میں بھی فطری طور پر کسر و انکسار سے ایسی اُجرتیں طے ہوتی رہیں گی جو فریقین کے لیے قابلِ قبول ہوں۔

۶۔ ارتقاء کے فطری اسباب پر اعتماد:۔ نظامِ سرمایہ داری کے وکیل کہتے ہیں کہ جب کاروبار میں منافع کا سارا انحصار ہی اس پر ہے کہ لاگت کم اور پیداوار زیادہ ہو، تو کاروباری آدمی کو اس کا اپنا ہی مفاد اس بات پر مجبور کرتا رہتا ہے کہ پیداوار بڑھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ بہتر سائنٹفک طریقے اختیار کرے، اپنی مشینوں اور آلات کو زیادہ سے زیادہ اچھی حالت میں رکھے، خام مواد بڑی مقدار میں کم قیمت پر حاصل کرے۔ اور اپنے کاروبار کے طریقوں کو اور اپنی تنظیمات کو ترقی دینے میں ہر وقت دماغ لڑاتا رہے۔ یہ سب کچھ کسی بیرونی مداخلت اور مصنوعی تدبیر کے بغیر، بے قید معیشت کی

اندرونی منطق خود ہی کراتی چلی جاتی ہے۔ فطرت کے قوانین کثیر التعداد منتشر افراد اور گروہوں کی انفرادی سعی و عمل سے اجتماعی ترقی اور خوشحالی کا وہ کام آپ ہی آپ لیتے رہتے ہیں جو کسی اجتماعی منصوبہ بندی سے اتنی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ فطرت کی منصوبہ بندی ہے جو غیر محسوس طور پر عمل میں آتی ہے۔

۷۔ **ریاست کی عدمِ مداخلت:۔** اس نظام کے حامیوں کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا اصولوں پر سوسائٹی کی فلاح و بہبود کا بہترین کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ افراد کو بلا کسی قید و بند کے آزادانہ کام کرنے کا موقع حاصل ہو۔ فطرت نے معاشی قوانین میں ایک ایسی ہم آہنگی رکھ دی ہے کہ جب وہ سب مل جل کر کام کرتے ہیں تو نتیجہ میں سب کی بھلائی حاصل ہوتی ہے حالانکہ ایک فرد اپنے ہی ذاتی نفع کے لیے سعی کر رہا ہوتا ہے جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے۔ جب افراد کو اپنی سعی کا صلہ غیر محدود منافع کی شکل میں ملتا نظر آتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے لیے اپنی ساری قوت و قابلیت صرف کر دیتے ہیں۔ اس سے لامحالہ سب لوگوں کے لیے اچھے سے اچھا مال وافر سے وافر مقدار میں تیار ہوتا ہے کھلے بازار میں جب تاجروں اور صناعوں اور خام پیداوار بہم پہنچانے والوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو قیمتوں کا اعتدال آپ سے آپ قائم ہوتا ہے، اشیاء کا معیار آپ سے آپ بلند ہوتا جاتا ہے اور خود ہی معلوم ہوتا رہتا ہے کہ سوسائٹی کو کن چیزوں کی کتنی ضرورت ہے۔ اس سارے کاروبار میں ریاست کا کام یہ نہیں ہے کہ پیدائش دولت کے فطری عمل میں خواہ مخواہ مداخلت کر کے اس کا توازن بگاڑے، بلکہ اس کا کام صرف یہ ہے

کہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں انفرادی آزادی عمل زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو سکے۔ اسے امن اور نظم قائم کرنا چاہیے، حقوقِ ملکیت کی حفاظت کرنی چاہیے، معاہدوں کو قانون کے زور سے پورا کرانا چاہیے اور بیرونی حملوں اور مزاحمتوں اور خطروں سے ملک کو اور ملک کے کاروبار کو بچانا چاہیے۔ ریاست کا منصب یہ ہے کہ منصف اور نگران اور محافظ کی خدمت انجام دے، نہ یہ کہ خود تاجر اور صنّاع اور زمیندار بن بیٹھے، یا تاجروں اور صناعوں اور زمینداروں کو اپنی بار بار کی خلل اندازی سے کام نہ کرنے دے۔

خرابی کے اسباب

یہ تھے وہ اصول جن کو پورے زور شور کے ساتھ جدید سرمایہ داری کی پیدائش کے زمانہ میں پیش کیا گیا، اور چونکہ ان کے اندر کسی حد تک مبالغہ کے باوجود صداقت پائی جاتی تھی، اس لیے ان کو بالعموم دنیا بھر سے تسلیم کرا لیا گیا۔ در حقیقت ان میں نئی بات کوئی بھی نہ تھی۔ ساری باتیں وہی تھیں جن پر غیر معلوم زمانے سے انسانی معیشت کا کاروبار انجام پاتا چلا آرہا تھا۔ جدت اگر تھی تو اس مبالغہ آمیز شدت میں تھی جو بعض اصولوں کو صنعتی انقلاب کے دور کی معیشت پر چسپاں کرنے میں بورژوا حضرات نے اختیار کی۔ مزید برآں انھوں نے اپنا سارا انتظام مدنیت ان فطری اصولوں ہی پر نہیں اٹھایا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے بلکہ ان کے ساتھ کچھ غلط اصولوں کی آمیزش بھی کر دی۔ پھر انھوں نے بعض دوسرے ایسے اصولوں کو نظر انداز بھی کر دیا جو ایک فطری نظام معیشت کے لیے اتنے

ہی اہم ہیں جتنے آزاد معیشت کے مذکورۂ بالا اُصول۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنی خود غرضیوں سے خود اپنے ہی پیش کردہ بعض اصولوں کی نفی بھی کر دی۔ یہی چاروں چیزیں مل جل کر ان خرابیوں کی موجب ہوئیں جو بالآخر جدید سرمایہ داری میں پیدا ہوتی چلی گئیں اور اس حد تک بڑھیں کہ دنیا میں اس کے خلاف ایک عام شورش برپا ہوگئی۔

مختصراً ہمیں ان اسبابِ خرابی کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے۔

(۱) بے قید معیشت کی حمایت میں جن "فطری قوانین" کا یہ لوگ بار بار حوالہ دیتے رہے ہیں وہ اس مبالغہ کی حد تک صحیح نہیں ہیں جو ان لوگوں نے نہ صرف اپنے بیان میں، بلکہ اپنے عمل میں برتنا چاہا۔ لارڈ کینیز نے بالکل سچ کہا ہے کہ "دنیا پر اخلاقی و فطری قوانین کی ایسی مضبوط حکومت قائم نہیں ہے جس کے زور سے افراد کے ذاتی مفاد اور سوسائٹی کے اجتماعی مفاد میں ضرور آپ ہی آپ موافقت ہوتی رہے۔ معاشیات کے اصولوں سے یہ استنباط کوئی صحیح استنباط نہیں ہے کہ روشن خیال خود غرضی ہمیشہ اجتماعی فلاح و بہبود ہی کے لیے کوشش کیا کرتی ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ خود غرضی ہمیشہ روشن خیال ہی ہوا کرتی ہے۔ اکثر تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ انفرادی طور پر اپنی اغراض کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ اس قدر نادان یا کمزور ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی اغراض کو بھی پورا نہیں کر سکتے کجا کہ ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت ضرور اور ہمیشہ انجام پاتی رہے۔"

صرف یہی نہیں کہ یہ مبالغہ آمیز باتیں عقلاً صحیح نہ تھیں، بلکہ تجربہ سے خود

بورژوا سرمایہ داروں کے اپنے عمل نے ثابت کر دیا کہ ان کی خود غرضی روشن خیال نہیں تھی۔ انھوں نے خریدار پبلک، اجرت پیشہ کارکن اور پُرامن حالات پیدا کرنے والی حکومت، تینوں کے مفاد کے خلاف جتھہ بندی کی اور باہم یہ سازش کر لی کہ صنعتی انقلاب کے سارے فوائد خود لوٹ لیں گے۔ ان کے اس باہمی ساز باز نے ان کی اس سب سے بڑی دلیل کو خود ہی توڑ دیا جو وہ آزاد معیشت کے حق میں پیش کرتے تھے، یعنی یہ کہ فطرۃً کسر و انکسار سے خود ہی سب لوگوں کے درمیان منفعت کا توازن قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخر کار آدم سمتھ جیسے شخص کو بھی، جو آزاد معیشت کا سب سے بڑا وکیل تھا یہ کہنا پڑا کہ:

"کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ جب کاروباری لوگ کہیں باہم جمع ہوں اور ان کی صحبت پبلک کے خلاف کسی سازش پر اور قیمتیں چڑھانے کے لیے کسی قرارداد پر ختم نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ تقریبات تک میں مل بیٹھنے کا جو موقع مل جاتا ہے اس کو بھی یہ حضرات اس جرم سے خالی نہیں جانے دیتے۔"

اسی طرح شخصی ملکیت اور آزادی سعی کے بارے میں ان کے یہ دعوے بھی بالکل مبالغہ آمیز تھے کہ ان عنوانات کے تحت افراد کو کچھ ایسے حقوق حاصل ہیں جن پر کوئی حد عائد نہ ہونی چاہیے۔ ایک شخص اپنی ملکیت میں اگر ایسے طریقہ سے تصرف کرتا ہے جس سے ہزارہا آدمیوں کی معیشت متاثر ہو جاتی ہے، یا ایک آدمی اگر اپنے ذاتی نفع کے لیے سعی و عمل کی کوئی ایسی راہ نکالتا ہے جس سے پوری سوسائٹی کی صحت، یا اخلاق، یا عافیت پر برا اثر پڑتا ہے، تو آخر کیا

وجہ ہے کہ اس کو ان کاموں کے لیے کھلی چھٹی دے دی جاتے اور قانون ایسے حدود عائد نہ کرے جن سے اس کے انفرادی حقوق کا استعمال اجتماعی مفاد کے لیے مضر نہ ہونے پائے۔ یہ حکومت کی عدم مداخلت کے مضمون کو ان لوگوں نے اس کی جائز حد سے اتنا زیادہ بڑھا دیا کہ وہ برے نتائج پیدا کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا جب طاقت ور افراد جتھہ بندی کر کے کثیر التعداد لوگوں سے ناجائز فائدے اٹھانے لگیں اور حکومت یا تو تماشا دیکھتی رہے یا خود ان طاقتور افراد ہی کے مفاد کی حفاظت کرنے لگے، تو اس کا لازمی نتیجہ شورش ہے، اور شورش جب برپا ہو جاتی ہے تو ہمیشہ اپنے ظہور کے لیے معقول راستوں ہی کی پابندی نہیں کیا کرتی۔

(۲) خصوصیت کے ساتھ صنعتی انقلاب کے دور میں بے قید معیشت کے اصولوں کا اتنا سخت مبالغہ اور بھی زیادہ غلط تھا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے طریق پیدا وار میں جو بنیادی تغیر واقع ہو گیا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے جو کام انسانی اور حیوانی طاقت سے کیے جاتے تھے اب ان کے لیے مشین کی طاقت استعمال کی جانے لگی۔ ایک مشین لگا لینے کے معنی یہ ہو گئے کہ دس آدمی وہ کام کرنے لگیں جو پہلے ہزار آدمی کرتے تھے۔ اس طریق پیداوار کی عین فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ چند انسانوں کو کام پہ لگا کر ہزاروں انسانوں کو بے کار کر دیتا ہے۔ ایسے ایک طریقہ کے متعلق ملکیت اور آزادی سعی کے مطلق حقوق کا دعوٰی اور حکومت کی عدم مداخلت کا مطالبہ اصولاً بالکل بے جا تھا۔ آخر یہ کس طرح جائز ہو سکتا تھا کہ ایک شخص یا گروہ محض اس وجہ سے کہ وہ ایسا کرنے کے ذرائع

رکھتا ہے۔ ایک خاص قسم کا مال تیار کرنے کے لیے اچانک ایک بڑا کارخانہ قائم کر دے اور اس کی کچھ پروا نہ کرے کہ اس کی اس حرکت سے پورے علاقے کے ان ہزارہا آدمیوں کے روزگار پر کیا اثر پڑتا ہے جو پہلے اپنے گھروں اور دوکانوں میں یا دستی کاریگری کی چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں میں بیٹھے وہی مال تیار کر رہے تھے؟ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مشین کی طاقت کو صنعت میں استعمال نہ ہونا چاہیے تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس طاقت کے استعمال کی اندھا دھند اجازت نہ ہونا چاہیے تھی اور حکومت کو اوّل روز ہی سے یہ فکر کرنی چاہیے تھی کہ ساتھ ساتھ ان لوگوں کے روزگار کا بندوبست بھی ہوتا جاتے جن کو یہ نئی صنعتی طاقت بیکار کر رہی تھی چونکہ ایسا نہیں ہوا، اسی وجہ سے مشینی طریق پیداوار کے وجود میں آتے ہی انسانی سوسائٹی میں بے روزگاری کا ایک مستقل مسئلہ اتنے بڑے پیمانہ پر پیدا ہو گیا جس سے تاریخ پہلے کبھی آشنا نہ ہوئی تھی۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ بیروزگاری کسی ایک مسئلے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی مادی، روحانی، اخلاقی اور تمدنی زندگی کے بے شمار پیچیدہ مسائل کا مورث اعلیٰ ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک فرد یا چند افراد کو کیا حق ہے کہ اپنی ملکیت میں ایسے طریقہ سے تصرف کریں جس سے اجتماعی زندگی میں اتنی زبردست پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں؟ اور اس طرح کے تصرف کے بارے میں کوئی مرد عاقل یہ کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ افراد کی وہ روشن خیال خودغرضی ہے جو آپ سے آپ اجتماعی مفاد کی خدمت کرتی رہتی ہے؟ اور ایسے انفرادی تصرفات کے معاملہ میں یہ خیال کرنا کتنی بڑی حماقت ہے کہ ان کا کھلا لائسنس دے کر قومی حکومت کو خاموش بیٹھ جانا چاہیے۔

اوران اثرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینی چاہییں جو ایک قلیل التعداد گروہ کی کار روائیوں سے پوری قوم کی زندگی پر پڑ رہے ہوں ؟

(۳) پھر اس طریق پیداوار نے جب ہزارہا بلکہ لکھوکھا آدمیوں کو بیروزگار کر دیا اور وہ مجبور ہو گئے کہ اپنے دیہات اور قصبات سے اور اپنے محلوں اور گلیوں سے نکل نکل کر ان بڑے بڑے کارخانہ داروں اور تاجروں کے پاس مزدوری یا نوکری تلاش کرتے ہوئے آئیں، تو لامحالہ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا اور یہی ہوا کہ یہ بھوکے مرتے ہوئے طالبین روزگار ان کم سے کم اُجرتوں پر کام کرنے کے لیے مجبور ہو گئے جو سرمایہ داروں نے ان کے سامنے پیش کیں۔ کام ان سب کو نہ ملا، بلکہ قابل کار آدمیوں کا ایک حصہ مستقلاً بے کار رہا۔ پھر جنہیں کام ملا وہ بھی اس پوزیشن میں نہ تھے کہ سرمایہ دار سے سودا چکا کر بہتر شرائط منوا سکتے، کیونکہ وہ تو خود طالب روزگار ہو کر آئے تھے، سرمایہ دار کی پیش کردہ شرائط قبول نہ کرتے تو شام کی روٹی تک کا بندوبست ان کے پاس نہ تھا، اور اس پر بھی کچھ اکڑ دکھاتے تو دوسرے ہزاروں بھوکے جھپٹ کر انہی شرائط پر روزگار اُچک لینے کے لیے تیار تھے۔ اس طرح بورژوا حضرات کا وہ سارا استدلال غلط ثابت ہو گیا جو وہ اس اصول کے حق میں پیش کرتے تھے کہ کھلے مقابلے میں اجیر اور مستاجر کے درمیان کسر و انکسار سے مناسب اور منصفانہ اُجرتیں آپ ہی آپ طے ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے کہ یہاں حقیقت میں مقابلے کے ساتھ اس کے "کھلے ہونے" کی شرط مفقود تھی۔ یہاں یہ صورت تھی کہ ایک آدمی نے ہزاروں آدمیوں کا رزق چھین کر پہلے اپنے قابو میں کر لیا، اور جب وہ بھوک سے تڑپ کر

اس کے پاس آتے تو وہ ان سب کو نہیں بلکہ ان کے صرف دسویں یا بیسویں حصہ کو کام دینے پر راضی ہوتا۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ سودا چکانے کی ساری طاقت اس ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی اور ان ہزاروں طالبین روزگار میں سے کوئی بھی اپنی شرائط منوانے کے قابل نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعتی انقلاب کے دور میں جدید سرمایہ داری جیسے جیسے بڑھتی گئی، سوسائٹی میں بے روزگاری کے علاوہ افلاس اور خستہ حالی کی مصیبت بھی بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے صنعتی و تجارتی مرکزوں میں جو لوگ محنت مزدوری اور نوکری کے لیے جمع ہوئے انھیں بہت کم اُجرتوں پر بہت زیادہ وقت اور محنت کرنے پر راضی ہونا پڑا۔ وہ جانوروں کی طرح کام کرنے لگے۔ جانوروں سے بدتر حالت میں شہروں کے تنگ و تاریک مکانات میں رہنے لگے۔ ان کی صحتیں برباد ہونے لگیں۔ ان کی ذہنیتیں پست ہونے لگیں۔ ان کے اخلاق بُری طرح بگڑنے شروع ہو گئے۔ نفسی نفسی کے عالم میں باپ بیٹے اور بھائی بھائی تک کے درمیان ہمدردی باقی نہ رہی۔ والدین کے لیے اولاد اور شوہروں کے لیے بیویاں تک وبال جان بن گئیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہا جو اس غلط اور یک رخی قسم کی آزاد معیشت کے بُرے اثرات سے بچا رہ گیا ہو۔

(۴) اس پر مزید لطف یہ ہے کہ وہی بورژوا حضرات جو وسیع المشربی اور جمہوریت کے زبردست داعی تھے، اور جنھوں نے لڑ بھڑ کر مالکانِ زمین کے مقابلہ میں اپنا ووٹ کا حق تسلیم کرایا تھا، اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ یہی ووٹ کا حق ان لاکھوں کروڑوں عوام کو بھی حاصل ہو جن کی روزی کے یہ

مالک بن گئے تھے۔ وہ اپنے لیے تو یہ حق سمجھتے تھے کہ ایک ایک پیشے کے مالکان کاروبار اپنی اپنی انجمنیں بنائیں اور باہمی قرارداد سے اشیاء کی قیمتیں، نوکروں کی تنخواہیں اور مزدوروں کی اُجرتیں تجویز کریں۔ لیکن وہ نوکروں اور مزدوروں کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ بھی منظم ہوں اور اجتماعی قوت سے اُجرتوں اور تنخواہوں کے لیے سودا چکائیں۔ حد یہ ہے کہ ان حضرات کو اپنے اس حق پر بھی اصرار تھا کہ وہ جب چاہیں کارخانہ بند کر کے ہزارہا ملازموں اور مزدوروں کو بیک وقت بے کار کر دیں اور اس طرح انہیں بھوکا مار کر کم اُجرتوں پر راضی ہونے کے لیے مجبور کریں۔ مگر وہ نوکروں اور مزدوروں کا یہ حق تسلیم کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے کہ وہ بھی ہڑتال کر کے اپنی اُجرتیں بڑھوانے کی کوشش کریں۔ اس کے ساتھ یہ حضرات اس بات کو سراسر جائز سمجھتے تھے کہ جو شخص انہی کے کارخانے یا تجارتی ادارے میں خدمت کرتے کرتے بوڑھا، یا بیمار، یا کسی طور پر از کار رفتہ ہو گیا ہو اسے وہ رخصت کر دیں، مگر وہ شخص جو رخصت کیا جا رہا ہو اُس کی یہ گزارش ان کے نزدیک بالکل ناروا تھی کہ حضور! صحت، طاقت، جوانی سب کچھ تو آپ کے کاروبار کی ترقی میں کھپا بیٹھا، اب اس جانِ ناتواں کو کہاں لے جاؤں اور ہاتھ پاؤں کی قوت کھو دینے کے بعد جو پیٹ بچا رہ گیا ہے اسے کس طرح بھروں؟ یہاں پہنچ کر بورژوا حضرات اپنے اس استدلال کو بھی بالکل بھول گئے جو وہ ذاتی مفاد کو ایک ہی صحیح محرکِ عمل قرار دینے کے حق میں پیش کرتے تھے۔ انھیں اپنے متعلق تو یہ یاد رہا کہ اگر ان کے لیے نفع کے امکانات غیر محدود ہوں گے تو وہ خوب کام کریں گے اور

اس طرح اجتماعی ترقی و خوشحالی کی خدمت آپ سے آپ انجام پائے گی لیکن اپنے نوکروں اور مزدوروں کے معاملہ میں وہ بھول گئے کہ جس کا نفع محدود ہی نہیں بلکہ تنگ ہو اور جس کا حال خراب اور مستقبل تاریک ہو وہ آخر کیوں دل لگا کر اور جان لڑا کر کام کرے اور کس بنا پر اپنے کام میں دلچسپی لے؟

(۵) علاوہ بریں ان لوگوں نے کاروبار کے فطری اور معقول طریقوں سے ہٹ کر اپنے ذاتی مفاد کے لیے ایسے طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے جو صریحاً اجتماعی مفاد کے خلاف ہیں اور جن سے مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھتی ہیں اور جن سے دولت کی پیداوار کی اور ترقی کی رفتار سست ہوتی ہے مثال کے طور پر:

یہ طریقہ کہ اپنے سرمائے کے زور سے اشیائے ضرورت کو خرید خرید کر ان کے گھتے بھرتے چلے جائیں یہاں تک کہ بازار میں ان کی رسد کم اور مانگ بڑھ جائے اور اس طرح قیمتیں مصنوعی طور پر گراں کی جا سکیں۔

اور یہ طریقہ کہ مال پیدا کرنے والے اور اصل استعمال کرنے والے کے درمیان سینکڑوں آدمی محض اپنے بینک کے روپے اور ٹیلیفون کے بل پر اس کو غائبانہ بیچتے اور خریدتے چلے جائیں اور اس طرح زبردستی ان کا منافع لگ لگ کر اس کی قیمت بڑھتی رہے بغیر اس کے کہ ان بیچ والوں نے اس مال کے پیدا کرنے یا ڈھونے یا اسے کارآمد بنانے کی کوئی خدمت انجام دی ہو جس کی بنا پر وہ منافع میں حصہ لینے کے جائز حقدار ہوں۔

اور یہ طریقہ کہ پیدا شدہ مال کو صرف اس اندیشہ سے جلا دیا جائے یا

سمندر میں پھینک دیا جائے کہ اتنی بڑی مقدار مال کے منڈی میں پہنچ جانے سے قیمتیں گر جائیں گی

اور یہ طریقہ کہ وافر سرمایہ کے بل پر ایک چیز از قسم سامانِ تعیش تیار کی جائے اور پھر اشتہار سے، ترغیب سے، مفت بانٹ بانٹ کر، طرح طرح کی سخن سازیاں کر کر کے زبردستی اس کی مانگ پیدا کی جائے اور اسے ان غریب اور متوسط الحال لوگوں کی ضروریاتِ زندگی میں خواہ مخواہ ٹھونس دیا جائے جو بیچارے اپنے فرائضِ حیات بھی پوری طرح بجا لانے کے قابل نہیں ہیں۔

اور یہ طریقہ کہ عامۃ الناس کو حقیقتاً جن چیزوں کی ضرورت اور شدید ضرورت ہے ان کی فراہمی پر تو سرمایہ اور محنت صرف نہ ہو اور ان کاموں پر وہ بے دریغ صرف کیا جائے جو بالکل غیر ضروری ہیں، صرف اس لیے کہ پہلی قسم کے کاموں کی بہ نسبت یہ دوسرے کام زیادہ نفع آور ہیں۔

اور یہ طریقہ کہ ایک شخص یا گروہ نہایت مضرِ صحت اور مخربِ اخلاق اور مفسدِ تہذیب و تمدن چیزوں کو اپنے سرمائے کے زور سے خوشنما اور دلفریب بنا بنا کر لائے اور علانیہ پبلک کے سفلی جذبات کو اپیل کر کر کے انھیں اپنے اس کاروبار کی طرف کھینچے اور ان کو دیوانہ بنا بنا کر ان کی قلیل آمدنیوں کا بھی ایک معتدبہ حصہ بٹور لے در آنحالیکہ ان غریبوں کی آمدنیاں ان کا اور ان کے بال بچوں کا پیٹ بھرنے تک کے لیے کافی نہ ہوں۔

اور سب سے بڑھ کر خطرناک اور تباہ کن یہ طریقہ کہ اپنے تجارتی اور مالی مفاد کے لیے کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈالے جائیں اور دنیا کو مختلف

حلقہائے اثر میں تقسیم کیا جائے، اور ہر قوم کے بڑے بڑے ساہوکار اور صناع اور تاجر اپنی اپنی قوموں کو اپنی حد سے بڑھی ہوئی اغراض کا آلۂ کار بنا کر ایک دوسرے کے خلاف ایسی دائمی کشمکش میں الجھا دیں جو نہ میدانِ جنگ میں تھمنے پائے نہ ایوانِ صلح میں۔

کیا یہ سب واقعی اس بات کے ثبوت ہیں کہ اگر افراد کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے بے روک ٹوک کام کرنے دیا جائے تو ان کے ہاتھوں اجتماعی مفاد کی خدمت خودبخود انجام پاتی رہتی ہے؟ اس طرح تو دراصل انھوں نے اپنے عمل سے خود یہ ثابت کر دکھایا کہ بے قید خود غرضی بہت ہی کم روشن خیال ہوتی ہے، خصوصاً جب کہ معاشی و سیاسی طاقت بھی اسی کے ہاتھ میں مرتکز ہو جائے اور قانون ساز بھی وہ خود ہی ہو۔ ایسے حالات میں تو اس کی بیشتر کوششیں اجتماعی مفاد کی خدمت میں نہیں بلکہ جماعت کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر بھینٹ چڑھانے میں صرف ہونے لگتی ہے۔

(۶) ان سب حرکات پر مزید غضب انھوں نے یہ کیا کہ افراد کے لیے اس بات کو بالکل جائز اور معقول اور برحق ٹھیرایا کہ وہ سرمایہ کو جمع کرکے اسے سُود پر چلائیں۔ سُود ایک قابلِ نفرت بُرائی کی حیثیت سے تو دنیا کے اکثر معاشروں میں ہمیشہ موجود رہا ہے اور دنیا کے قوانین نے بھی بسا اوقات اس کو بکراہت گوارا کیا ہے۔ لیکن قدیم جاہلیتِ عرب کے بعد یہ فخر صرف جدید جاہلیتِ غرب کے پورژوا مفکرین کو حاصل ہُوا کہ انھوں نے اسے کاروبار کی ایک ہی معقول صورت اور پُورے نظامِ مالیات کی ایک ہی صحیح بنیاد

بنا کر رکھ دیا اور ملکی قوانین کو اس طرز پر ڈھالا کہ وہ قرضدار کے بجائے سُود خوار کے مفاد کی پشت پناہ بن گئے ۔ اس عظیم الشان غلطی پر اور اس کے نتائج پر تو ہم نے اپنی کتاب "سُود" میں مفصل بحث کی ہے، مگر یہاں اس سلسلۂ کلام میں مختصراً صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ سُود کو قرض و استقراض اور مالی لین دین کی بنیاد بنا دینے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بے روک ٹوک صنعتی انقلاب کی وجہ سے طاقت، دولت، رسُوخ و اثر اور تمام فوائد و منافع کا جو بہاؤ پہلے ہی ایک رُخ پر چل پڑا تھا وہ اس کارروائی کی وجہ سے اور زیادہ یک رُخا ہو گیا اور اس کی بدولت اجتماعی زندگی کا عدمِ توازن اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اب سوسائٹی میں سب سے زیادہ خوش قسمت وہ لوگ ہو گئے جو کسی نہ کسی ترکیب سے کچھ سرمایہ اکٹھا کر کے بیٹھ گئے ہوں۔ دماغی قابلیت رکھنے والے، محنت کرنے والے، کاروباری اسکیمیں سوچنے اور ان کی تنظیم کرنے والے اپنی جان کھپا کر کاروبار کو ہر مرحلے پر چلانے والے اور اشیاءِ ضرورت کی تیاری و فراہمی کے سلسلے کی ساری خدمات انجام دینے والے، غرض سب کے سب اس ایک آدمی کے سامنے ہیچ ہو گئے جو کاروبار میں روپیہ قرض دے کر اطمینان سے گھر بیٹھا ہوا ہو۔ ان سب کا نفع غیر معیّن اور غیر یقینی ہے اور اس کا نفع معیّن اور یقینی ۔ ان سب کے لیے نقصان کا خطرہ بھی ہے مگر اس کے لیے خالص منافع کی گارنٹی ۔ یہ سب کاروبار کے بھلے اور بُرے میں دلچسپی لینے پر مجبُور ہیں، اور وہ ہر چیز سے بے پروا صرف اپنے سُود سے غرض رکھتا ہے ۔ کاروبار فروغ پاتا نظر آئے تو وہ بے تحاشا اس میں سرمایہ لگانا شروع کر دیتا ہے ۔ یہاں تک کہ نفع کے امکانات ختم ہونے لگتے ہیں۔

کاروبار پھر دُوبار نظر آتے تو وہ مدد کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاتا بلکہ پہلے کا لگا ہُوا سرمایہ بھی کھینچنے لگتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا پر سخت کساد بازاری کا دَورہ پڑ جاتا ہے۔ ہر حال میں نقصان، زحمت، خطرے، سب کچھ دوسروں کے لیے ہیں اور اس کے لیے حد سے حد اگر کوئی اتار چڑھاؤ ہے تو وہ صرف نفع کی کمی بیشی کا تاجر اور صناع اور زمیندار ہی نہیں، حکومتیں تک اس کی مزدُور بنی ہوتی ہیں۔ اس کے دیتے ہوئے روپے سے وہ سڑکیں، ریلیں، نہریں اور دوسری چیزیں بناتی ہیں اور برسوں نہیں، صدیوں ایک ایک شخص سے ٹیکس وصول کر کر کے اس کا سُود اس کے گھر پہنچاتی رہتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ قوم کو اگر کوئی لڑائی پیش آجاتی ہے تو جن کی جان جاتے، یا جن کے ہاتھ پاؤں کٹیں، یا جن کا گھر برباد ہو، یا جو اپنے باپ بیٹے یا شوہر سے محروم ہوں، ان سب کے بارے تو قومی خزانہ بآسانی سبکدوش ہو جاتا ہے، لیکن قوم ہی کے جن چند افراد نے لڑائی کے لیے سرمایہ قرض دے دیا ہو اُن کا سُود سو سو اور دو دو سو برس تک ادا کیا جاتا رہتا ہے اور اس سُود کی ادائیگی میں ان لوگوں تک کو "چندہ" دینا پڑتا ہے جنھوں نے اسی جنگ میں جانیں قربان کی تھیں۔ اس طرح یہ سُودی نظام مالیات سوسائٹی کی دولت پیدا کرنے والے اصل عاملین کے ساتھ ہر طرح ہر جہت میں ایک ہمہ گیر بے انصافی کرتا ہے۔ اس نے ساری اجتماعی معیشت کی باگیں چند خود غرض سرمایہ داروں کے ہاتھ میں دے دی ہیں جو نہ تو اجتماع کی فلاح و بہبُود سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں نہ فی الواقع اجتماع کی کوئی خدمت ہی انجام دیتے ہیں، مگر چونکہ پورے معاشی کاروبار کی جان یعنی سرمایہ ان کے قبضہ میں ہے اور قانون نے ان کو اسے روک رکھنے اور

سُود پر چلانے کے اختیارات دے رکھے ہیں، اس لیے وہ صرف یہی نہیں کہ اجتماع کی مجموعی محنت سے پیدا ہونے والی دولت کے شریک غالب بن گئے ہیں، بلکہ ان کو یہ طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ پُورے اجتماع کو اپنے مفاد کا خادم بنا لیں اور قوموں اور ملکوں کی قسمتوں سے کھیلتے رہیں۔

(۷) جدید سرمایہ داری کی ان بنیادوں پر جو نیا معاشرہ وجود میں آیا وہ ہمدردی، تعاون، رحم، شفقت اور اس نوع کے تمام جذبات سے عاری اور اس کے برعکس صفات سے لبریز تھا۔ اس نظام میں غیر تو غیر، بھائی پر بھائی کا یہ حق نہ رہا کہ وہ اسے سہارا دے۔ ایک طرف ہر نئی مشین کی ایجاد سیکڑوں اور ہزاروں کو یک وقت بیکار کیے دے رہی تھی، اور دوسری طرف حکومت، سوسائٹی، کارخانہ دار یا ساہوکار، کسی کی بھی یہ ذمہ داری نہ تھی کہ جو لوگ بے روزگار ہو جائیں، یا کام کرنے کے قابل نہ ہوں، یا ناکارہ ہو جائیں، ان کی بسر اوقات کا کوئی بندوبست کرے۔ یہی نہیں بلکہ اس نئے نظام نے ایسے حالات پیدا کر دیئے اور ایسے اخلاقیات بھی عام لوگوں کے اندر اُبھار دیئے کہ کسی گرے ہوتے یا گرتے ہوئے انسان کو سنبھالنا کسی کا فرض نہ رہا۔ حوادث، بیماری، موت اور تمام دوسرے ناموافق حالات کے لیے اس نظام نے جتنے علاج بھی تجویز کیے، ان لوگوں کے لیے جو فی الوقت کما رہے ہوں اور اپنی موجودہ ضروریات سے اتنا زیادہ کما رہے ہوں کہ کچھ پس انداز کر سکیں۔ لیکن جو کما ہی نہ رہا ہو، یا بس بقدر سدِ رمق کما رہا ہو، وہ اپنے بُرے وقت پر کہاں سے مدد پاتے؟ اس کا کوئی جواب جدید سرمایہ داری کے پاس اس کے سوا نہیں ہے کہ ایسا شخص مہاجن کے پاس جائے اور اپنے چھنے

کے کپڑے یا گھر کے برتن، یا جورو کا زیور رہن رکھ کر تین تین سو فی صد سالانہ سُود پر قرض لے، اور جب یہ قرض مع سُود ادا نہ ہو سکے تو پھر اسی مہاجن سے اسی کا قرض و سُود ادا کرنے کے لیے مزید سُودی قرض لے لے۔

(۸) ظاہر ہے کہ جب سوسائٹی میں لاکھوں آدمی بے روزگار ہوں، اور کروڑوں اس قدر قلیل المعاش ہوں کہ سخت حاجت مند ہونے کے باوجود وہ مال نہ خرید سکیں جو دوکانوں میں بھرا پڑا ہو، تو صنعت اور تجارت کو پُورا پُورا ممکن فروغ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ عجیب و غریب صورت حال دیکھ رہے ہیں کہ اگرچہ ابھی دنیا میں بے حد و حساب قابلِ استعمال ذرائع موجود ہیں، اور کروڑوں آدمی کام کرنے کے قابل بھی موجود ہیں، اور وہ انسان بھی کروڑہا کروڑ کی تعداد میں موجود ہیں جو اشیاءِ ضرورت کے محتاج اور اشیاءِ عیش و رفاہیت خریدنے کے خواہشمند ہیں، مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دنیا کے کارخانے اپنی استعداد کار سے بہت گھٹ کر جو مال تیار کرتے ہیں وہ بھی منڈیوں میں اس لیے پڑا رہ جاتا ہے کہ لوگوں کے پاس خریدنے کو روپیہ موجود نہیں، اور لاکھوں بے روزگار آدمیوں کو کام پر اس لیے نہیں لگایا جا سکتا کہ جو تھوڑا سا مال تیار ہے وہی بازار میں نہیں نکلتا، اور سرمایہ اور قدرتی ذرائع بھی پوری طرح زیرِ استعمال اس لیے نہیں آنے پاتے کہ جس قلیل پیمانے پر وہ استعمال میں آتے ہیں اسی کا بار آور ہونا مشکل ہو رہا ہے کجا کہ مزید ذرائع کی ترقی پر مزید سرمایہ لگانے کی کوئی ہمت کر سکے۔ یہ صورت حال بُورژوا مفکرین کے اس استدلال کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے تھے کہ بے قید معیشت میں اپنے انفرادی نفع کے لیے

افزائی تک ودود خود بخود ذرائع و وسائل کی ترقی اور پیداوار کی افزائش کا سامان کرتی رہتی ہے۔ ترقی اور افزائش تو درکنار، یہاں تو تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ انھوں نے اپنی نادانی سے خود اپنے منافع کے راستے میں بھی رکاوٹیں پیدا کرلیں۔

سوشلزم اور کمیونزم

یہ تھے وہ اصل اسباب جن کی وجہ سے صنعتی انقلاب کے پیدا کیے ہوئے نظامِ تمدّن و معیشت میں خرابیاں رُونما ہوئیں۔ پچھلے صفحات میں ہم نے ان کا جو تجزیہ کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ درحقیقت ان خرابیوں کے موجب وہ فطری اصُول نہیں تھے جن کو بورژوا حضرات بے قید معیشت کی تائید میں پیش کرتے تھے، بلکہ ان کی اصلی موجب وہ غلطیاں تھیں جو ان صحیح اصولوں کے ساتھ انھوں نے ملا دی تھیں۔

اگر بروقت ان غلطیوں کو سمجھ لیا جاتا اور اہلِ مغرب کو وہ حکیمانہ رہنمائی مل جاتی جن سے وہ اس نئے انقلابی دَور میں ایک متوازن اور معتدل معیشت کی تعمیر کر لیتے تو ان کے لیے بھی اور ساری دنیا کے لیے بھی صنعتی انقلاب ایک نعمت اور برکت ہوتا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ مغربی ذہن اور کیرکٹر نے اس دَور میں بھی اپنی انہی کمزوریوں کا اظہار کیا جو اس سے پہلے کے زمانوں میں اس سے ظاہر ہو چکی تھیں، اور اسی بے اعتدالی کی ڈگر پر بعد کی تاریخ بھی آگے بڑھی جس پر وہ پہلے سے بھٹک کر جا پڑی تھی۔ پہلے جس مقام پر مالکانِ زمین اور اربابِ کلیسا اور شاہی خاندان تھے، اب اسی ہٹ دھرمی اور ظلم و زیادتی کی جگہ بورژوا

طبقے نے سنبھال لی اور پہلے جن طلبی اور شکوہ شکایت اور غصہ و احتجاج کے جس مقام پر بورژوا حضرات کھڑے تھے، اب اس جگہ محنت پیشہ عوام آکھڑے ہوئے۔ پہلے جس طرح جاگیرداری نظام کے مطمئن طبقے نے اپنے بے جا امتیازات اور اپنے ناروا "حقوق" اور اپنی ظالمانہ قیود کی حمایت میں دین اور اخلاق اور قوانینِ فطرت کی چند صداقتوں کو غلط طریقہ سے استعمال کرکے محروم طبقوں کا مُنہ بند کرنے کی کوشش کی تھی، اب بعینہٖ وہی حرکت سرمایہ داری نظام کے مطمئن طبقوں نے شروع کر دی۔ اور پہلے جس طرح غصّے اور ضد اور جھنجھلاہٹ میں آکر بورژوا لوگوں نے جاگیرداروں اور پادریوں کی اصل غلطیوں کو سمجھنے اور ان کا ٹھیک تدارک کرنے کے بجائے اپنی نبرد آزمائی کا بہت سا زور ان صداقتوں کے خلاف صرف کر دیا جن کا سہارا ان کے حریف لیا کرتے تھے، اسی طرح اب محنت پیشہ عوام اور ان کے لیڈروں نے بھی غیظ و غضب میں نظر و فکر کا توازن کھو دیا اور بورژوا تمدّن کی اصل خرابیوں اور غلطیوں پر حملہ کرنے کے بجائے ان فطری اصولوں پر ہلّہ بول دیا جن پر ابتدائے آفرینش سے انسانی تمدّن و معیشت کی تعمیر ہوتی چلی آرہی تھی۔ متوسط طبقوں کے لوگ تو اپنی کمزوریوں اور برائیوں کے باوجود پھر کچھ ذہین اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اس لیے انھوں نے شکایت اور ضد کے جوش میں بھی تھوڑا بہت ذہنی توازن برقرار رکھا تھا لیکن صدیوں کے پسے اور دبے ہوئے عوام جن کے اندر علم، ذہانت، تجربہ ہر چیز کی کمی تھی، جب طبقوں سے بے قرار و شکایات سے لبریز ہو کر بھڑک گئے تو کسی بات کو قبول کرنے سے پہلے عقل و حکمت کے ترازو میں

تول کر اسے دیکھ لینے کا کوئی سوال اُن کے سامنے نہ رہا۔ ان کو سب سے بڑھ کر اپیل اس مسلک نے کیا جس نے سب سے زیادہ شدت کے ساتھ ان کی نفرت اور ان کے غصے اور ان کے انتقام کے تقاضے پُورے کیے۔

یہی تھا وہ غریبوں کی جھنجلاہٹ کا فرزندِ ارجمند جسے "سوشلزم"[1] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جدید سرمایہ داری کو پیدا ہوئے نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت نہ گزری تھی جب وہ تولد ہُوا اور اس کی ولادت پر نصف صدی سے کچھ بہت زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس کے ہنگاموں سے دنیا لبریز ہو گئی۔

سوشلزم اور اُس کے اصول

اس نئے مسلک کے مصنفوں نے اپنے حملے کی ابتدا "حقوقِ ملکیت"

---

[1] سوشلزم کے اصل معنی ہیں "اجتماعیت" اور یہ اصطلاح اس انفرادیت (Individualism) کے مقابلہ میں بنائی گئی تھی جس پر جدید سرمایہ داری کا نظام تعمیر ہُوا تھا اس نام کے تحت بہت سے مختلف نظریے اور مسلک کارل مارکس سے پہلے پیش کیے جا چکے تھے ہو گئے تھے جن کا مشترک مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا نظامِ زندگی بنایا جائے جس میں بحیثیت مجموعی پُورے اجتماع کی فلاح ہو۔ لیکن وہ سب کاغذ پر رہ گئے۔ مارکس نے آکر اس طلب عام کا جواب ایک خاص قسم کے سوشلزم کی شکل میں دیا جسے "سائنٹیفک سوشلزم"، "مارکسزم" اور "کمیونزم" وغیرہ کے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم اسی سے بحث کر رہے ہیں کیونکہ زمین میں جڑ اسی نے پکڑی۔ اصطلاحات کے معاملہ میں علمی نزاکتوں کو قصداً نظر انداز کر کے ہم وہ اصطلاحیں استعمال کر رہے ہیں جن سے ہمارے عام اردو خواں لوگ یا تو پہلے ہی مانوس ہیں یا جنہیں اردو زبان بآسانی قبول کر سکتی ہے۔

سے کی۔ انھوں نے کہا کہ اصل خرابی کی جڑ یہی بلا ہے۔ پہننے کے کپڑے، استعمال کے برتن، گھر کا فرنیچر اور اس طرح کی دوسری چیزیں انفرادی ملکیت میں رہیں تو مضائقہ نہیں، مگر یہ زمین اور مشین اور آلات اور دوسری ایسی چیزیں جن سے دولت کی پیداوار ہوتی ہے، ان پر تو افراد کے مالکانہ حقوق ہرگز قائم نہ رہنے چاہییں۔ اس لیے کہ جب ایک شخص ان میں سے کسی چیز کا مالک ہوگا تو دولت پیدا کرے گا۔ دولت پیدا کرے گا تو جمع کرے گا۔ جمع کرے گا تو پھر کچھ اور زمین یا مشین خرید کر پیدائش دولت کے ذرائع میں اضافہ کرے گا۔ اضافہ کرے گا تو دوسرے آدمیوں سے تنخواہ، یا مزدوری یا لگان کا معاملہ طے کر کے ان سے کام لے گا۔ اور جب یہ کرے گا تو لامحالہ پھر وہ سب کچھ کرے گا جو بورژوا سرمایہ دار کر رہا ہے۔ لہٰذا سرے سے اس جڑ ہی کو کاٹ دو جس سے یہ بلا پیدا ہوتی ہے۔ پروانے کی جان بچانی ہے تو نرگس کو باغ میں جانے نہ دو۔

سوال پیدا ہوا کہ اشیاءِ استعمال کے حقوقِ ملکیت کی طرح ذرائع پیداوار کے حقوقِ ملکیت بھی کوئی آج کی نئی چیز تو نہیں ہیں جنہیں بورژوا سرمایہ داروں نے تصنیف کر لیا ہو۔ یہ تو وہ بنیادیں ہیں جن پر قدیم ترین زمانہ سے انسانی معیشت و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی چلی آرہی ہے۔ ایسی چیز کے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ آخر یوں سرسری طور پر کیسے کر ڈالا جائے! ــــــــــ جواب میں فی البدیہہ ایک پوری تاریخ گھڑ دی گئی کہ انسانیت کے آغاز میں ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت کے حقوق تھے ہی نہیں، یہ تو بعد میں طاقت ور طبقوں نے اپنی خودغرضی سے قائم کر لیے۔

کہا گیا، ان حقوق کو سارے مذاہب، تمام اخلاقی نظام، دنیا بھر کے قوانین ہمیشہ سے مانتے رہے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نظریہ اختیار نہیں کیا کہ معیشت و تمدن کی وہ صورت بجائے خود غلط ہے جو ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت سے بنتی ہے —— جواب میں ایک لمحہ کے تامل کے بغیر دعویٰ کر دیا گیا کہ مذہب، اخلاق اور قانون تو ہر زمانے کے غالب طبقوں کے آلۂ کار رہے ہیں۔ پیدائش دولت کے ذرائع پر جن طبقات کا اجارہ قائم ہو گیا انھیں اپنے اس اجارے کو محفوظ اور مضبوط کرنے کے لیے کچھ نظریات، کچھ اصولوں اور کچھ رسموں اور ضابطوں کی حاجت لاحق ہوئی اور جن لوگوں نے یہ چیزیں اُن کی اغراض کے مطابق بنا کر پیش کر دیں وہ پیغمبر اور رشی اور معلمین اخلاق اور شارع و مقنن قرار دے لیے گئے۔ محنت پیشہ طبقے بہت مدت تک اس طلسم فریب کے شکار رہے، اب وہ اسے توڑ کر رہیں گے!

اعتراض ہوا کہ ان حقوق کو مٹانے اور ختم کرنے کے لیے تو ایک ایسی سخت نزاع برپا کرنی پڑے گی جس میں ہر قوم کے مختلف عناصر آپس ہی میں گتھ جائیں گے اور قریہ قریہ اور بستی بستی میں طبقاتی جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی ——— جواب میں کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک پورا فلسفۂ تاریخ گھڑ کر رکھ دیا گیا جس میں ثابت کیا گیا کہ انسانی تمدن کا تو سارا ارتقاء ہی طبقاتی جنگ کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ اس راستہ کے سوا ارتقاء کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

پھر اعتراض ہوا کہ اپنے ذاتی نفع کے لیے کام کرنا تو انسان کی فطرت اور جبلت میں پیوستہ ہے اور ہر انسان ماں کے پیٹ سے یہی میلان لیے ہوئے

پیدا ہوتا ہے۔ تم جب افراد سے ذرائع پیداوار کی ملکیت چھین لوگے اور ان کے لیے یہ موقع باقی نہ رہنے دوگے کہ وہ جتنی کوشش کریں اتنا نفع حاصل کرتے چلے جائیں، تو ان کے اندر کوشش کرنے کا جذبہ ہی نہ پیدا ہوگا اور یہ چیز بالآخر انسانی تہذیب و تمدن کے لیے برباد کن ثابت ہوگی ——— اس پر چھوٹتے ہی برملا جواب دیا گیا فطرت؟ جبلّت؟ موروثی میلانات؟ یہ کیا بورژوا پن کی باتیں کرتے ہو۔ انسان کے اندر ان ناموں کی کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے تو سارے رجحانات صرف اجتماعی ماحول کی پیداوار ہیں۔ ایک ماحول کو بدل کر دوسرا ماحول پیدا کر دو، اس کا دماغ دوسری طرح سوچنے لگے گا، اس کا دل دوسری قسم کے جذبات کی آماجگاہ بن جائے گا، اس کے نفس سے کچھ اور ہی میلانات کی نزاوش شروع ہو جائیگی۔ جب تک انفرادی ملکیت کا نظام قائم ہے، لوگ "انفرادی الذہن" ہیں۔ جب اجتماعی ملکیت کا نظام قائم ہو جائے گا، یہی سب لوگ اجتماعی الذہن ہو جائیں گے۔

پوچھا گیا، انفرادی ملکیت ختم کر کے آخر سارا معاشی کاروبار چلایا کیسے جائے گا؟ ——— جواب ملا، تمام ذرائع پیداوار (زمین، کارخانے، اور ہر قسم کے تجارتی و صنعتی ادارے) افراد کے قبضے سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیئے جائیں گے، جو لوگ ان اداروں میں کام کریں گے انہی میں ان کے منافع تقسیم ہو جائیں گے، اور ان کارکنوں کے ووٹوں سے ہی وہ منتظمین منتخب ہوا کریں گے جن کے ہاتھ میں اس ساری معیشت کا انتظام ہوگا۔

سوال اٹھا، جو لوگ اس وقت زمینوں اور کارخانوں اور دوسرے ذرائع پیداوار کے مالک ہیں ان کی ملکیت ختم کرنے اور اجتماعی ملکیت قائم کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ ——— اس سوال کے دو مختلف جواب دیئے گئے :

ایک مسلک والوں نے جواب دیا اس تغیر کے لیے جمہوری طریقے اختیار کیے جائیں گے، رائے عامہ کو ہموار کر کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا جائے گا اور قانون سازی کے ذریعہ سے بتدریج زرعی جائدادوں اور صنعتوں اور تجارتوں کو بعض حالات میں بلا معاوضہ اور بعض حالات میں معاوضہ ادا کر کے، اجتماعی ملکیت بنا لیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے اب بالعموم "سوشلسٹ" کا لفظ مخصوص ہوگیا ہے، اور کبھی کبھار ان کے مسلک کو "ارتقائی سوشلزم" بھی کہتے ہیں۔

دوسرے مسلک والوں نے کہا جمہوری طریقوں سے یہ تغیر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے انقلابی طریق کار ناگزیر ہے۔ نادار اور محنت پیشہ عوام کو منظم کیا جائے گا۔ ملکیت رکھنے والے طبقوں کے خلاف ہر ممکن طریقے سے جنگ کی جائے گی۔ بورژوا حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ قائم کی جائے گی۔ مالکان زمین سے ان کی زمینیں اور کارخانہ داروں سے ان کے کارخانے اور تاجروں سے ان کی تجارتیں زبردستی چھین لی جائیں گی۔ جو مزاحمت کرے گا اُسے فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ سارے طبقات کو ختم کر کے تمام آبادی کو ایک طبقہ (یعنی اپنے ہاتھ سے کام کر کے روٹی کمانے والا طبقہ) بنا دیا جائے گا۔ اور از روئے قانون یہ چیز حرام کر دی جائے گی کہ ایک شخص

دوسرے شخص یا اشخاص سے اُجرت پر کام لے اور اس کام کا نفع کمائے[1]۔ پھر جب یہ انقلاب مکمل ہو جائے گا اور سرمایہ دار طبقات کے از سرِ نو جی اٹھنے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا تو یہ ڈکٹیٹر شپ آپ سے آپ خدا جانے کس طرح، سوکھ کر جھڑ جائے گی اور خود بخود (نہ معلوم کیسے) ایک ایسا نظم اس کی جگہ لے گا جس میں حکومت اور جبر کے بغیر زندگی کے سارے شعبے لوگوں کی باہمی رضامندی، مشاورت اور تعاون سے چلتے رہیں گے۔ اس دوسرے مسلک کا نام "انقلابی سوشلزم" ہے۔ اسی کو "بولشوزم" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا رہا ہے اسی کو "مارکسزم" بھی کہتے ہیں۔ مگر اب دنیا اس کو زیادہ تر "کمیونزم" کے مشہور و معروف نام سے جانتی ہے۔

ستر اسی سال تک سوشلزم کا یہ نیا مسلک اپنی بے شمار شاخوں اور اپنے مختلف الاقسام مذاہب فکر کے ساتھ یورپ اور اس کے زیر اثر ملکوں میں پھیلتا رہا۔ ابتداءً یہ چند سر پھروں کی ایک نرالی اُپج تھی جس کے مقدمات اور دلائل اور نتائج، سب قطعی مہمل تھے اور صرف غضب ناک مزدوروں ہی میں اس کو علم و عقل کی بنا پر نہیں بلکہ بھڑکے ہوئے جذبات کی بنا پر مقبولیت

---

[1] واضح رہے کہ کمیونسٹ نظریہ کی رُو سے اگر کوئی درزی یا نانبائی تنہا خود اُجرت پر کپڑے سیئے یا لوگوں کو روٹی پکا کر دے تو اس کا یہ کام جائز ہے۔ لیکن اگر وہ کسی ایک لڑکے کو مزدوری یا تنخواہ پر رکھ لے اور اپنے کام میں اس سے مدد لینے لگے تو اسی وقت وہ "بورژوا" بن جائے گا اور اس کا سارا کاروبار ایسا سخت جرم ہو جائیگا جس کی کم از کم سزا ضبطی جائداد ہے۔

حاصل ہو رہی تھی لیکن مغربی ذہن کی دلچسپ کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اُپج کو بہت پسند کرتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ نہایت لغو ہو اور اس کا پیش کرنے والا بے دھڑک اور بے جھجک ہو کر بڑے سے بڑے مسلمات کو کاٹتا چلا جائے اور اپنے دعاوی کو ذرا سائنٹفک طریقہ سے آتنا مرتب کر لے کہ ان کے اندر ایک "سسٹم" پیدا ہو جائے۔ یہ خصوصیات اس "سائنٹفک سوشلزم" میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے نچلے متوسط طبقے کے بہت سے ذہین لوگ اور خود بورژوا طبقہ میں سے بعض خبطی اور بعض ہوشیار لوگ اس مسلک کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کی شرح و تفسیر اور دعوت و تبلیغ میں کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ڈھیر لگنے شروع ہو گئے، دنیا بھر کے ملکوں میں مختلف سوشلسٹ نظریات کی حامی پارٹیاں منظم ہو گئیں، اور آخر کار انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد سنجیدگی کے ساتھ یہ سمجھنے لگی کہ ان نظریات پر ایک نظامِ تمدن و معیشت تعمیر ہو سکتا ہے۔

کمیونزم اور اس کا میزانیۂ نفع و نقصان

جہاں تک ارتقائی سوشلزم کا تعلق ہے اس نے ابھی دنیا میں اپنا کوئی نمونہ

لہ یہ بات کسی جغرافی تعصب کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے۔ مشرق میں جو مغرب زدہ ذہن پیدا ہوا ہے اس کا حال اس سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ مغربی ذہن پھر غنیمت ہے کہ کچھ اپج کی بات دیکھ کر اس پر ریجھتا ہے اور ایک سسٹم اور سائنٹفک طرز کو تو پسند کرتا ہے مگر یہاں وہ غلام ذہن جنم لے رہا ہے جس کو مرعوب و متاثر کرنے والی اصل چیز صرف یہ ہوتی ہے کہ بات مغرب کے کسی امام کی کہی ہوئی ہے۔

پیش نہیں کیا ہے جس کو دیکھ کر ہم پورے طور پر معلوم کر سکیں کہ اس کا طریق کار کس طرح انفرادی سرمایہ داری کے نظام کو اجتماعیت میں تبدیل کرے گا اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لیے ہم اس کو چھوڑ کر یہاں انقلابی اشتراکیت، یعنی کمیونزم کے کارنامے کا جائزہ لیں گے، جس نے ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اول سے فائدہ اٹھا کر روس میں فی الواقع ایک انقلاب برپا کر دیا اور اپنے نظریات کے مطابق ایک پورا نظامِ تمدن قائم کر ڈالا۔[1]

روسی اشتراکیت چونکہ پچھلے کئی سال سے سخت مباحثوں اور مناظروں کا موضوع بنی رہی ہے، اس لیے اس کی میزان نفع و نقصان بنانے میں اس کے حامیوں اور مخالفوں، دونوں کی طرف سے بڑی کھینچ تان ہوتی رہتی ہے۔ اس کے حامی اس کے نفع کے پلڑے میں بہت سی ایسی چیزوں کو داخل کر دیتے ہیں جو دراصل اشتراکیت کے منافع نہیں ہیں بلکہ قابل اور مستعد لوگوں کے ہاتھ میں انتظام ہونے کے ثمرات ہیں۔ دوسری طرف اس کے مخالف اس کے نقصان کے پلڑے میں بہت سی ان خرابیوں کو رکھ دیتے ہیں جو بجائے خود اشتراکیت کے نقصانات نہیں بلکہ ظالم اور تنگ ظرف افراد کے برسرِ اقتدار آنے کے نتائج ہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ سوشلزم اور کمیونزم میں فرق صرف طریق کار کا ہے۔ رہا یہ اصول کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دیا جائے، تو وہ دونوں میں مشترک ہے۔ اس لیے طریقہ کی بحث کو الگ کر کے ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے فوائد اور نقصانات پر جو کچھ بھی گفتگو کی جائے گی وہ ان دونوں مسلکوں پر چسپاں ہوگی۔

اشتراکی روس کے حامیوں کا یہ طریقہ کہ وہ عہد زار کے روس کی خستہ حالی جہالت اور پس ماندگی سے موجودہ روس کی علمی، ذہنی صنعتی اور تمدنی حالت کا مقابلہ کرتے ہیں، اور حاصل جمع و تفریق میں جتنی ترقی نکلتی ہے اس سب کو اشتراکیت کی برکات کے خانے میں درج کر دیتے ہیں، اصولاً کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ تیس بتیس سال کی مدت میں جتنی کچھ بھی ترقی روس نے کی ہے اس کا مقابلہ اگر امریکہ، جاپان یا جرمنی کے ایسے ہی تیس بتیس سال سے کیا جائے تو شاید تناسب کچھ زیادہ ہی نکلے گا۔ مثلاً ۱۸۶۸ء میں جاپان تعلیم اور صنعت و حرفت اور قدرتی وسائل کے استعمال اور پیداوار دولت کے لحاظ سے کیا کچھ تھا اور ۱۹۰۴ء میں جب اس نے روس کو شکست دی تو وہ ان حیثیات سے کس مرتبے پر پہنچ گیا تھا یا ۱۸۷۰ء میں جرمنی کی کیا حالت تھی اور بیسویں صدی کے آغاز تک پہنچتے پہنچتے اس کے باشندے علمی اور ذہنی حیثیت سے اور اس کے معاشی وسائل اپنی پیداوار کے لحاظ سے کہاں تک جا پہنچے تھے۔ اگر ان ترقیات کا اتنی ہی مدت کی روسی ترقیات سے موازنہ کر کے دیکھا جائے تو روس کے حساب میں آخر کتنا سرمایۂ افتخار نکلے گا؟ پھر کیا یہ اصول مان لیا جائے کہ ایک ملک نے ایک خاص زمانہ میں اگر کچھ غیر معمولی ترقی کی ہو تو اس کی ساری تعریف ان اصولوں کے حق میں لکھ دی جائے جن پر اس ملک کا نظام تمدن و معیشت و سیاست قائم ہو؟ حالانکہ بسا اوقات اجتماعی زندگی کا سارا کارخانہ غلط اصولوں پر چل رہا ہوتا ہے، مگر رہنماؤں کی انفرادی خوبیاں اور ان کے مددگاروں کی عمدہ صلاحیتیں بڑے شاندار نتائج پیدا کر دکھاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اشتراکی روس کی جن خرابیوں کا حوالہ اس کے

مخالفین دیتے ہیں ان میں بھی بہت سی خرابیاں وہ ہیں جو کم و بیش اسی طرح طریقہ پر غیر اشتراکی جباروں کی فرمانروائی میں بھی پائی جاتی ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ان سب کو بڑے افراد کے حساب میں سے نکال کر اس اصول کے حساب میں ڈال دیں جس پر ان کا نظام تمدن و معیشت قائم ہوا ہے؟

فوائد

غیر متعلق چیزوں کو الگ کر کے جب ہم اصل اشتراکیت کے اس کارنامے پر نگاہ ڈالتے ہیں جو روسی تجربے کی بدولت ہمارے سامنے آیا ہے، تو نفع کے خانے میں ہم کو یہ چیزیں ملتی ہیں:-

(۱) افراد کے قبضے سے زمین، کارخانے اور تمام کاروبار نکال لینے کا یہ فائدہ ہوا کہ اشیاء کی لاگت اور ان کی بازاری قیمت کے درمیان جو منافع پہلے زمیندار، کارخانہ دار اور تاجر لیتے تھے وہ اب حکومت کے خزانے میں آنے لگا، اور یہ ممکن ہو گیا کہ اس منافع کو اجتماعی فلاح کے کاموں پر صرف کیا جا سکے۔

(۲) تمام ملک کے ذرائع پیداوار ایک ہی نظم و نسق کے قبضہ میں آجانے سے یہ ممکن ہو گیا کہ ایک طرف ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ان سب کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور زیادہ سے زیادہ مفید طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی جاتے اور دوسری طرف سارے ملک کی ضروریات کو سامنے رکھ کر انھیں پورا کرنے کی منظم تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

(۳) سارے وسائلِ دولت پر قابض ہو کر جب حکومت ایک جامع منصوبہ بندی کے مطابق ان کو چلانے لگی تو اس کے لیے یہ بھی ممکن ہو گیا کہ ملک کے تمام

قابلِ کار آدمیوں کو کام پر لگائے اور یہ بھی کہ وہ ان کو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق تعلیم و تربیت دے کر اس طرح تیار کرے کہ اجتماعی معیشت کے لیے جن پیشوں اور خدمات کے لیے جتنے آدمی درکار ہیں اتنے ہی وہ تیار کئے جاتے رہیں۔

(۴) اوپر نمبر ایک میں زراعت صنعت اور تجارت کے جن منافعے کا ذکر کیا گیا ہے وہ جب حکومت کے ہاتھ میں آگیا تو وہ اس قابل ہوگئی کہ اس منافع کا ایک حصہ وہ سوشل انشورنس کے انتظام پر صرف کرے۔ سوشل انشورنس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ملک میں جو لوگ کام کرنے کے قابل نہ ہوں، یا عارضی یا مستقل طور پر ناقابلِ کار ہو جائیں، یا بیماری، زچگی اور دوسرے مختلف حالات کی وجہ سے جن کو مدد کی ضرورت پیش آئے ان کو ایک مشترک فنڈ سے مدد دی جائے۔

نقصانات

کوئی شک نہیں کہ بے قید معیشت سے جو بیماریاں پیدا ہوئی تھیں، اس آپریشن نے ان کا خوب ہی علاج کیا مگر روس کو اس کی قیمت کیا دینی پڑی؟ اور پچھلی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے دوسری کیا بیماریاں اس نے مول لیں؟ اب ذرا اس کا جائزہ بھی لے لیں:

(۱) افراد کے قبضہ سے زمینوں، کارخانوں اور دوسرے ذرائع پیداوار کو نکالنا اور ان ساری چیزوں کو اجتماعی ملک بنا دینا بہرحال کوئی کھیل نہ تھا کہ بس ہنسی خوشی انجام پا گیا ہو۔ یہ ایک بڑا ہی سخت کام تھا جو برسوں تک مسلسل نہایت ہولناک ظلم و ستم کرنے سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ہر شخص خود ہی قیاس کر سکتا ہے کہ آپ لاکھوں آدمیوں کو ان کی چھوٹی بڑی املاک سے زبردستی بے دخل کرنے

پر تُل جائیں تو وہ بآسانی آپ کے اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم نہ کردیں گے۔ یہ کام جب اور جہاں بھی ہوگا سخت کشت وخون ہی سے ہوگا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس اسکیم کو عمل میں لانے کے لیے تقریباً ۱۹ لاکھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، ۲۰ لاکھ آدمیوں کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں، اور چالیس پچاس لاکھ آدمیوں کو ملک چھوڑ کر دنیا بھر میں تتر بتر ہو جانا پڑا۔ صرف ایک اجتماعی زراعت کی اسکیم نافذ کرنے کے لیے لاکھوں چھوٹے چھوٹے اور متوسط زمینداروں (Kulaks) کو جس بے دریغ طریقہ سے فنا کیا گیا اس پر تو خود روس کے پُرجوش حامی بھی چیخ اُٹھے۔

(۲) جو لوگ تمام دنیا کے مسلّم مذہبی، اخلاقی اور قانونی اصُولوں کے مطابق اپنی املاک کے جائز مالک ہوں انہیں اگر آپ اپنی ایک خود ساختہ اور نرالی اسکیم نافذ کرنے کے لیے زبردستی ان کی ملکیتوں سے بے دخل کرنا چاہیں گے تو لامحالہ آپ کو نہ صرف ان تمام مذہبوں اور اخلاقی اصُولوں کا جو آپ کے نظریہ کے خلاف ہیں، انکار کرنا پڑے گا، بلکہ ملکیتوں کے ساتھ ان کی بھی بیخ کنی پر اپنی ساری قوت لگا دینی ہوگی۔ مزید برآں اپنی اس اسکیم کو ہر قسم کی بے دردی، شقاوت، ظلم، جھوٹ اور فریب سے نافذ کرنے کے لیے آپ مجبور ہوں گے کہ سرے سے ایک نیا ہی نظریۂ اخلاق وضع کریں جس کے تحت ہر ظلم وجبر اور ہر بے دردی اور سنگدلی کا ارتکاب جائز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی لیڈروں اور کارکنوں نے اپنے پیش نظر انقلاب کو عمل میں لانے کے لیے خدا اور مذہب کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا، اور بورژوا طبقہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی

طبقوں کو بھی بڑی سختی سے کچلا، اور اخلاق کا ایک نیا نظریہ پیدا کیا جو لینن کے الفاظ میں یہ ہے:

"ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصوّر پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماوراء ہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلّی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لیے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لیے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب مضبوط اور منظم ہوں اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی و ابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لیے جنگ کی جائے۔"

"ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے۔"

یہ دوسری بھاری قیمت تھی جو سرزمین روس کو اشتراکی نظام کے لیے دینی پڑی۔ یعنی صرف ایک کروڑ آدمیوں کی زندگی ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ دین، ایمان، اخلاق، انسانیت، شرافت اور وہ سب کچھ جو ایک انوکھی اسکیم کو جبر و ظلم سے نافذ کرنے میں مانع تھا۔

(۳) ہم خود اپنے ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ جب ایک مختصر

عالمِ اخلاقیات کے بند ڈھیلے ہو جاتے ہیں، اور دُوسری طرف مختلف ضروریاتِ زندگی پر سرکاری کنٹرول نافذ کر دیا جاتا ہے، تو رشوت، خیانت اور غبن کا سلسلہ بے تحاشا چل پڑتا ہے۔ زندگی کی جو ضرورت بھی پرمٹ، لائسنس، راشن کارڈ یا کوٹا ملنے پر موقوف ہو جاتی ہے اسی کے معاملے میں پبلک کو ہر طرح تنگ ہونا پڑتا ہے اور سرکاری آدمیوں کے وارے نیارے ہونے لگتے ہیں۔ اب خود اندازہ کر لیجیے کہ جہاں ایک طرف سارے ہی اخلاقی مسلّمات کی جڑیں ہلا ڈالی گئی ہوں، اور اخلاق کا یہ اصول لوگوں کے ذہن نشین کر دیا گیا ہو کہ جو کچھ مفید مطلب ہے وہی حق اور صدق ہے اور ملک کے رہنماؤں نے خود بدترین ظلم و ستم کر کے اس نئے اخلاق کے شاندار نمونے دکھا دیئے ہوں ——— دوسری طرف جہاں ضرورت کی صرف چند چیزیں نہیں بلکہ ملک کی پوری معاشی دولت اور سارے وسائلِ زندگی سرکاری کنٹرول میں ہوں، وہاں رشوت، خیانت، غبن اور مردم آزاری کی کیسی کچھ گرم بازاری ہو گی۔ یہ معاملہ صرف قیاس کی حد تک نہیں ہے۔ رُوس کے "آہنی پردے" سے چھن چھن کر جو خبریں وقتاً فوقتاً باہر آ جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں عمّالِ حکومت اور مختلف معاشی اداروں کے اربابِ انتظام نے "بدکرداری" (Corruption) کا ایک اچھا خاصا سخت مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ درحقیقت وہاں اس مسئلے کا پیدا ہونا قابلِ تعجب نہیں ہے بلکہ نہ ہونا تعجب کے قابل ہوتا۔ ایک نظام کو تم بداخلاقی کے زور سے توڑ بھی سکتے ہو، اور دوسرا نظام بداخلاقی کے زور سے قائم بھی کر سکتے ہو لیکن کسی نئے نظام کو بداخلاقی کے بل بوتے پر چلائے جانا سخت مشکل ہے۔ اسے

ٹھیک ٹھیک چلانے کے لیے بہرحال عمدہ اور مضبوط سیرت کے آدمیوں کی ضرورت ہے اور اس کا سانچہ تم خود پہلے ہی توڑ چکے ہو۔

(۴) انفرادی ملکیتوں کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کے اصول پر ملک کے معاشی نظام کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے سب سے بڑھ کر جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سے خود غرضی اور ذاتی نفع کی طلب نکال دی جائے۔ اور ان صفات کے بجائے اُن کے ذہن پر مجموعی بھلائی کے لیے کام کرنے کا جذبہ اتنا غالب کر دیا جائے کہ وہی ان کے اندر اصل محرک عمل بن جائے۔ اشتراکیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ انسانی فطرت اور جبلت اور موروثی میلانات محض بورژوا فلسفہ و سائنس کے ڈھکوسلے ہیں۔ اس نام کی کوئی چیز انسان کے اندر موجود نہیں ہے ہم ذاتی نفع طلبی اور خود غرضی کے میلانات لوگوں کے اندر سے نکال ڈالیں گے اور ماحول کے تغیر سے اجتماعی ذہنیت ان میں پیدا کر دیں گے۔ لیکن اس بے بنیاد دعوے کو عملی جامہ پہنانے میں اشتراکی حضرات قطعی ناکام ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے عوام اور اپنے نظامِ معیشت و تمدن کے کارفرماؤں اور کارکنوں میں حقیقی اجتماعی ذہنیت اُس مقدار سے ایک ماشہ بھر بھی زیادہ نہیں بڑھا سکے جتنی ہر سوسائٹی کے لوگوں میں فطرۃً موجود رہتی ہے۔ وہ ان کے اندر سے خود غرضی و نفع طلبی کو نکال دینا تو درکنار اسے کم بھی نہ کر سکے، بلکہ انہیں تھک ہار کر آخر کار اسے سیدھی طرح تسلیم کرنا پڑا اور لوگوں سے کام لینے کے لیے ان کی خود غرضی ہی کو اپیل کرنا پڑا۔ اس حد تک تو خیر وہ بورژوا نظام زندگی کے برابر رہے مگر جس چیز نے ان کو بورژوا نظام سے بھی زیادہ خرابی میں مبتلا کیا وہ یہ ہے کہ

جب انہوں نے افراد کی نفع طلبی کے لیے زراعت، صنعت، تجارت اور دوسرے فائدہ مند کاروبار کے فطری راستے بند کر دیئے اور مصنوعی پروپیگنڈا کے ذریعہ سے اس نفع طلبی کے صاف اور سیدھے اور معقول مظاہر کو خواہ مخواہ معیوب ٹھہرا دیا، تو یہ جذبہ اندر دب گیا، اور انسان کے تمام دوسرے دبے ہوئے جذبات کی طرح اس نے بھی منحرف (Pervert) ہو کر اپنے ظہور کے لیے ایسی غلط راہیں نکال لیں جو سوسائٹی کی جڑیں اندر ہی اندر کھوکھلی کر رہی ہیں۔ اشتراکی معاشرے میں رشوت، خیانت، چوری، غبن، اور اسی طرح کی دوسری برائیوں کے بڑھنے میں اس چیز کا بڑا دخل ہے۔ وہاں اگر کوئی چیز ممنوع ہے تو صرف یہ کہ ایک آدمی اپنی کمائی ہوئی دولت کو مزید دولت پیدا کرنے والے کسی کاروبار میں لگائے۔ اس کے سوا دولت کے سارے مصرف اسی طرح کھلے ہوئے ہیں جس طرح ہماری سوسائٹی میں ہیں۔ ایک آدمی اپنے لباس، خوراک، مکان، سواری، فرنیچر، اور سامان عیش و عشرت پر جتنا چاہے روپیہ خرچ کر سکتا ہے، اپنا معیار زندگی جتنا چاہے بلند کر سکتا ہے، عیاشی و خوش باشی کی وہ ساری ہی صورتیں دل کھول کر اختیار کر سکتا ہے جو مغربی سوسائٹی میں مباح ہیں۔ اس سے جو روپیہ بچے اسے جمع کر سکتا ہے، اس جمع کردہ دولت کو (براہ راست خود تو نہیں مگر) حکومت کے ذریعہ سے کاروبار میں لگا سکتا ہے اور اس پر آٹھ دس فی صدی سالانہ تک سود پا سکتا ہے، اور جب مرنے لگے تو اس جمع شدہ دولت کو اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ سکتا ہے۔

(۵) اس قدر کشت و خون اور اکھیڑ پچھاڑ اور اتنے بڑے پیمانے پر دین و

اخلاق اور انسانیت کی بربادی جس غرض کے لیے برداشت کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ اشیاء کی لاگت اور ان کی بازاری قیمت کے درمیان جو منافع صرف زمیندار اور کارخانہ دار اور تاجر طبقے کھا جاتے ہیں وہ چند مخصوص طبقوں کی جیب میں جانے کے بجائے پوری سوسائٹی کے خزانے میں آتے اور سب پر برابری کے ساتھ یا کم از کم انصاف کے ساتھ تقسیم ہو۔ یہی انفرادی ملکیتوں کو ختم کرنے کی اصل غرض تھی اور یہی اگر حاصل ہوتی تو اسے اجتماعی ملکیت کا اصلی فائدہ کہا جا سکتا تھا۔ مگر کیا واقعی یہ مقصد پورا ہوا؟ ذرا تجزیہ کر کے دیکھیے کہ انفرادی ملکیتوں کو ختم کرنے سے زراعت، صنعت اور تجارت کے جو منافع اجتماعی خزانے میں آ رہے ہیں وہ تقسیم کس طرح ہوتے ہیں۔

حکومت کے تمام شعبوں اور معاشی کاروبار کے تمام اداروں میں ادنیٰ ملازمین اور اعلیٰ عہدہ داروں کے درمیان معاوضوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کسی بورژوا سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ ایک طرف عام کارکن کی تنخواہ اور اس کی زندگی کا معیار امریکہ و انگلستان کے مزدوروں کی بہ نسبت بہت پست ہے اور ہندوستان و پاکستان کے معیار سے اگر کچھ اونچا ہے تو کچھ بہت زیادہ نہیں۔ دوسری طرف ڈائرکٹروں اور منیجروں اور حکومت کے عہدہ داروں اور فوجی افسروں اور ایکٹروں اور ایکٹرسوں اور مصنفین و مولفین وغیرہ کی آمدنیاں بڑھتے بڑھتے کئی کئی لاکھ روبل سالانہ تک پہنچ گئی ہیں۔ گویا اگر پوری طرح نہیں تو ایک بڑی حد تک یہ تجارتی و صنعتی منافع اونچے اور نیچے طبقوں کے درمیان اسی نامساوی طریقہ سے تقسیم ہو رہا ہے جس طرح پہلے محنت پیشہ مزدوروں

اور بورژوا لوگوں کے درمیان ہوتا تھا۔

پھر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے محنت پیشہ عوام اور بورژوا لوگوں کے درمیان نفرت اور بغض اور انتقام کی جو عالمگیر آگ بھڑکائی گئی اس نے تمام دنیا کے غیر اشتراکی معاشروں کو رُوس کا مخالف بنا دیا اور اس بنا پر رُوس مجبور ہو گیا کہ انفرادی ملکیتوں کو ختم کرکے جو تجارتی و صنعتی منافعہ اُس نے بورژوا طبقوں کے ہاتھوں میں جانے سے بچایا تھا اس کا ایک بڑا حصہ جنگی تیاریوں پر صرف کر دے۔

ان دو بڑی بڑی مدوں میں کھپ جانے کے بعد اس منافعے کا جتنا حصہ محنت پیشہ عوام کے نصیب میں آیا ہے وہ بس وہی ہے جو "سوشل انشورنس" کے کام میں صرف ہوتا ہے۔ اور کل منافعے کے مقابلے میں اس کا تناسب کیا ہے؟ انتہائی مبالغہ کے ساتھ بمشکل ایک یا دو فیصدی[1]۔

سوال یہ ہے کہ اگر اتنا ہی کچھ، بلکہ اس سے زیادہ اچھی طرح کسی اور طریقہ سے

---

[1] سوشل انشورنس کا فنڈ روس میں جس طریقہ سے فراہم کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ادارے کا نظم و نسق بحیثیت مجموعی جتنی رقم کارکنوں کے معاوضوں پر صرف کرتا ہے اس کا دس فیصدی سے لے کر ۲۰ فی صدی تک ایک حصہ ایک مخصوص قاعدے کے مطابق سوشل انشورنس اسکیم کے حساب میں جمع کر دینا ہوتا ہے۔ اس طرح اوسطاً تمام ملک کی تنخواہوں اور مزدوریوں کے مجموعہ کا ۱۵ فی صدی حصہ کارکنوں کی اجتماعی بہتری پر صرف ہو رہا ہے۔ یہ بمشکل ہی تمام کل معاشی منافع کا ایک یا دو فی صدی حصہ بنتا ہے۔

سوشل انشورنس کے پیسے ملنے لگے تو پھر اس مار دھاڑ اور ظلم وستم اور اس قربانی دین و اخلاق کے ساتھ انفرادی ملکیتیں ختم کرنے اور خواہ مخواہ اجتماعی ملکیت کا ایک مصنوعی نظام انسانی زندگی پر ٹھونسنے کی آخر حاجت ہی کیا ہے؟

(۶) اجتماعی ملکیت، اجتماعی نظم ونسق اور اجتماعی منصوبہ بندی کو رائج کرنے کے لیے جان ومال اور مذہب واخلاق اور انسانیت کی جو اتنی بربادی رُوس کو برداشت کرنی پڑی وہ تو گویا اس تجربے کے آغاز کی لاگت تھی۔ مگر اب رُو بعمل آجانے کے بعد روزمرہ کی زندگی میں وہ اہلِ رُوس کو دے کیا رہا ہے اور ان سے لے کیا رہا ہے؟ اس کا بھی ذرا موازنہ کر دیکھیے۔ وہ جو کچھ انہیں دیتا ہے وہ یہ ہے کہ:

ہر شخص کے لیے کم ازکم اتنے روزگار کا انتظام ہو گیا ہے جس سے وہ دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ پا سکے اور اجتماعی طور پر اس امر کا بھی انتظام ہو گیا ہے کہ بُرے وقت پر آدمی کو سہارا مل سکے۔

بس یہی وہ اصل فائدے ہیں جو اس نئے نظام نے باشندگانِ ملک کو دیئے۔ اب دیکھیے کہ اس نے لیا کیا۔

انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ یہ کام وہی پارٹی اپنے ہاتھ میں لے جو اس نظریہ کو لے کر اٹھی تھی، یعنی کمیونسٹ پارٹی ——— اس پارٹی کا نظریہ خود بھی یہ تھا، اور خود اس کام کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ایک زبردست ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جو پُورے زور کے ساتھ انفرادی

ملکیت کے نظام کو توڑ دے اور سخت ہاتھوں سے نئے نظام کو رائج کر دے۔ چنانچہ یہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی اور اس کو کارکنوں کی ڈکٹیٹر شپ کا نام دیا گیا۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ روس کے مزدوروں اور کاشت کاروں اور مختلف شعبہائے زندگی کے کارکنوں کی ساری آبادی کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہیں ہے۔ شاید اس آبادی کے ۵ فی صدی لوگ بھی پارٹی کے ممبر نہ ہوں گے۔ پس ظاہر میں تو نام یہ ہے کہ یہ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ ہے۔ مگر حقیقت میں یہ مزدوروں پر کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ ہے۔

اور یہ ڈکٹیٹر شپ بھی کچھ ہلکی پھلکی سی نہیں۔ اجتماعی ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے تمام زمیندار ختم کر دیئے گئے اور ایک وحدہٗ لاشریک زمیندار سارے ملک کی زمین کا مالک ہو گیا۔ سارے کارخانہ دار اور تجار اور مستاجر بھی ختم ہو گئے اور ان سب کی جگہ ایسے سرمایہ دار نے لی جو ذرائع پیداوار کی ہر قسم اور ہر صورت پر قابض ہو گیا۔ اور پھر اسی کے ہاتھ میں سارے ملک کی سیاسی طاقت بھی مرکوز ہو گئی۔ یہ ہے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ۔ اب اگر روس میں بظاہر آپ یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اس پوری معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو استعمال کر رہے ہیں وہ عام آبادی کے ووٹوں ہی سے منتخب ہوا کرتے ہیں تو کیا فی الواقع اس کے معنی جمہوریت کے ہیں؟ سارے روس میں کس کی ہمت ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کے مقابلے میں ووٹ مانگنے کے لیے اٹھ سکے؟ اور اگر کوئی جرأت کرے بھی تو وہ سرزمینِ روس میں کھائے گا کہاں سے؟ اور اپنی آواز اٹھائے گا کس پریس سے؟ اور اپنی بات سنانے کے لیے ملک میں سفر کن ذرائع سے کرے گا؟

بلکہ یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اس کو زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ طے کرنے میں دیر کتنی لگے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں حکومت کے پاس اتنی طاقت جمع ہو جاتی ہے جو تاریخِ انسانی میں کبھی کسی چنگیز اور ہلاکو لوز زار اور قیصر کے پاس بھی جمع نہیں ہوئی تھی۔ جو گروہ ایک دفعہ اس طاقت پر قابض ہو جائے پھر اس کے مقابلہ میں اہل ملک بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ کسی قسم کی بگڑی ہوئی حکومت کو بدل دینا اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر ایک بگڑی ہوئی اشتراکی حکومت کو بدلنا مشکل ہے۔

اس نظامِ حکومت میں برسرِ اقتدار پارٹی ملک کی مجموعی زندگی کے لیے جو منصوبہ (Plan) بناتی ہے اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے وہ پریس کو، ریڈیو کو، سینما کو، مدرسے کو، پوری انتظامی مشینری کو اور پورے ملک کے معاشی کاروبار کو ایک خاص نقشے کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا انحصار ہی اس پر ہے کہ تمام ملک میں سوچنے اور رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے والے دماغ صرف وہ چند ہوں جو مرکز میں بیٹھے منصوبہ بنا رہے ہیں۔ باقی سارا ملک صرف عملدرآمد کرنے والے دست و پا پر مشتمل ہو جو "تعمیلِ ارشاد" میں چون و چرا تک نہ کریں۔ تنقید اور نکتہ چینی اور رائے زنی کرنے والوں کے لیے اس نظام میں جیل اور تختۂ دار کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اگر ایسے دخل در معقولات دینے والے کو ملک بدر کر دیا جائے تو یہ گویا اس کے ساتھ بڑی رعایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں خود کمیونسٹ پارٹی کے بڑے بڑے سربرآوردہ کارکنوں اور لیڈروں تک کو جن کی محنتوں اور قابلیتوں

ہی کی بدولت اشتراکی تجربہ کامیابی کی منزل تک پہنچا، موت! درحبس دوام اور جلاوطنی کی سزائیں دے ڈالی گئیں۔ صرف اس لیے کہ انہوں نے برسرِ اقتدار گروہ سے اختلاف کی جرأت کی تھی۔ پھر یہ اشتراکی اخلاقیات کا طرفہ تماشا ہے کہ جس کو بھی اختلاف کے جرم میں پکڑا گیا اس پر طرح طرح کے ہولناک الزامات بے تحاشا لگا دیئے گئے اور اشتراکی عدالتوں میں بھی یہ ایک حیرت انگیز کرامت پائی جاتی ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی جس کو بھی ان کے سامنے ملزموں کے کٹہرے میں لاکھڑا کرتی ہے وہ استغاثے کے عین منشا کے مطابق اپنے جرائم کی فہرست خود ہی فر فر سناتا چلا جاتا ہے اور کچھ دبی زبان سے نہیں بلکہ پورے زور شور کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ وہ بڑا غدار اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ، اور روس کی آستین کا سانپ ہے!

پھر چونکہ یہ نظام انفرادی ملکیتوں اور مذہبی طبقوں کو زبردستی کچل کر قائم کیا گیا ہے اور ابھی وہ سب لوگ دنیا سے اور خود روس کی سرزمین سے مٹ نہیں گئے ہیں جن کے جذبات وحسیات اور حقوق کی قبر پر یہ قصر تعمیر ہوا ہے اس لیے کمیونسٹ پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ کو ہر وقت روس میں جوابی انقلاب کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ علاوہ بریں اشتراکی حضرات یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کے انکار کے باوجود انسانی فطرت نام کی ایک چیز موجود ہے جو انفرادی نفع طلبی کا جذبہ رکھتی ہے، اور وہ ہر وقت زور لگا رہی ہے کہ پھر انفرادی ملکیت کا نظام واپس آجائے۔ انہی وجوہ سے ایک طرف کمیونسٹ پارٹی خود اپنے نظام کو

آئے دن "جلاب" دیتی رہتی ہے تاکہ جن لوگوں میں "رجعت" کی ذراسی بُو بھی پائی جائے انہیں صاف کیا جاتا رہے[1]۔ اور دوسری طرف پارٹی کی حکومت سارے ملک میں جوابی انقلاب کے خطرات، امکانات، بلکہ شبہات اور وہم گمان تک کو مٹا دینے کے لیے ہر وقت تُلی رہتی ہے۔ اُس نے جاسوسی کا ایک وسیع نظام قائم کر رکھا ہے جس کے بے شمار کارکن ہر ادارے، ہر گھر اور ہر مجمع میں "رجعت پسندوں" کو سونگھتے پھرتے ہیں۔ اس جاسوسی کے پُر اسرار جال نے شوہروں اور بیویوں تک کے درمیان شک وشبہ کی دیوار حائل کر دی ہے۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے خلاف خود ان کی اولاد تک سے جاسوسی کی خدمت لینے میں دریغ نہیں کیا گیا ہے۔ رُوس کی پولیس اور سی آئی ڈی کا "محتاط" نظریہ یہ ہے کہ اگر بھول چوک سے چند سو یا چند ہزار بے گناہ آدمی پکڑے اور مار ڈالے جائیں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ چند گنہگار چھوٹ جائیں اور

---

[1] اس "صفائی" کا عمل اب تک کمیونسٹ پارٹی کے لاکھوں ممبروں پر ہو چکا ہے۔ روس میں اس عمل کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ ایک آدمی جو پارٹی کی رکنیت کے لیے موزوں نہیں ہے اسے پارٹی سے نکال دیا جائے، بلکہ اس عمل اخراج کے بعد شاذونادر ہی کوئی خوش قسمت آدمی رُوسی خفیہ پولیس کے عذاب خانوں (Torture Chambers) میں جانے سے بچ سکتا ہے اور ان عذاب خانوں سے باہر نکلنے کا راستہ بالعموم یا تو قبرستان کی طرف جاتا ہے یا پھر ان انسانی باڑوں (Concentration Camps) کی طرف جہاں جیتے جی آدمی کو جہنم کا مزا چکھایا جاتا ہے۔

ان کے ہاتھوں سے جوابی انقلاب برپا ہو جائے۔ اسی لیے وہ ہر فیکٹری ہر کان ہر دفتر اور ہر ادارے میں دیکھتے رہتے ہیں کہ کون سا مزدور یا کارکن ملک کے یا خود اپنے ادارے کے انتظام پر ناک بھوں چڑھاتا ہے یا کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کا کوئی فعل کرنا تو درکنار جس پر شبہ ہو جائے کہ وہ ایسے جرائم رکھتا ہے وہ بھی اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ آئے دن کا معمول ہے اس لیے جب کوئی کارکن رات کو اپنے گھر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھتی ہے کہ پکڑا گیا۔ دوسرے دن وہ اس کی ضرورت کی چیزیں آپ ہی آپ پولیس کے دفتر میں پہنچانی شروع کر دیتی ہے اور ان کا قبول کر لیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کا قیاس صحیح تھا۔ وہ کوئی سوال کرے تو دفتر کی طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایک روز یکایک ایسا ہوتا ہے کہ اس کا بھیجا ہوا پارسل واپس آ جاتا ہے۔ بس یہی اس امر کی اطلاع ہے کہ اس کا خاوند بیدنو کو پیارا ہوا۔ اب اگر وہ نیک بخت خود بھی اسی انجام سے دوچار ہونا نہ چاہتی ہو تو اس کا فرض ہے کہ ایک اچھی کامریڈنی کی طرح اس معاملہ کی بھاپ تک منہ سے نہ نکالے اور دوسرا کوئی ایسا خاوند ڈھونڈے جو "رجعت پسندی" کے شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور بُرے وقت کی دستگیری کے لیے اشتراکی رُوس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ کیا واقعی اس قیمت پر یہ سودا سستا ہے؟ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی ایسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی نسبت

بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہاں کم از کم دو وقت
کی روٹی، تن ڈھانکنے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جگہ تو نصیب ہوگی۔ مگر کیا اب
پوری نوعِ انسانی کے لیے فی الواقع یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اسے روٹی
اور آزادی دونوں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟ کیا روٹی ملنے کی اب یہی ایک
صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری روئے زمین ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈز
اس کے جیلر اور وارڈر ہوں؟

ردِّ عمل

رُوس میں اشتراکیت نے اپنا نظام قائم کرنے کے لیے جتنے بڑے پیمانے پر جیسے سخت ہولناک ظلم کیے، اور پھر اس انقلاب کی کامیابی نے دُنیا کے ہر ملک میں طبقاتی جنگ کی سُلگتی ہوئی آگ پر جو تیل چھڑکا، اس نے تمام غیر اشتراکی ممالک کے اہلِ فکر کو یہ سوچنے پر مجبُور کر دیا کہ وہ بے قید معیشت کے اصولوں اور طریقوں میں کیا ترمیم کریں جس سے محنت پیشہ طبقوں کی شکایات رفع ہوں اور ان کا ملک اشتراکی انقلاب کے خطرے میں پڑنے سے بچ جائے۔ اگرچہ بے قید معیشت کی بُرائیاں اسی وقت سے نمایاں ہونی شروع ہو گئی تھیں جب سے جدید سرمایہ داری کا نظام قائم ہُوا۔ اس پر تنقید برابر ہوتی رہی۔ اس میں سطحی اور جزوی اصلاحات بھی کچھ نہ کچھ ہوتی رہیں۔ لیکن تغیر، ترمیم اور اصلاح کی ضرورت کا حقیقی احساس رُوسی اشتراکیت کے عمل، اثرات اور نتائج کو دیکھ کر ہی پیدا ہُوا، اور اس ردِّ عمل نے نظام سرمایہ داری کے دو بڑے بڑے علاقوں میں دو مختلف صورتیں اختیار کیں

جن قوموں کے نظامِ زندگی کو جنگِ عظیم اوّل نے بُری طرح درہم برہم کر

دیا تھا اور جنہیں اشتراکیت کی بھڑکائی ہوئی طبقاتی جنگ سے کامل تباہی کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اور جن کی سرزمین میں جمہوریت کی جڑیں کچھ مضبوط بھی نہ تھیں، ان کے ہاں فاشزم اور نازی ازم نے جنم لیا۔

جن قوموں میں جمہوریت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی اور جن کے نظام زندگی میں جنگ نے کچھ بہت زیادہ خلل بھی نہیں ڈالا تھا انھوں نے اپنی پرانی وسیع المشرب جمہوری سرمایہ داری کو اس کی نظری بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے صرف اسی کی "مدبے قیدی" میں ایسی اصلاحات کرنے کی کوشش کی جس سے اس کے نقصانات دُور ہو جائیں۔

فاشزم اور نازی ازم

اشتراکی حضرات بالعموم اٹلی کی فاشی اور جرمنی کی نازی تحریک کو سرمایہ داری کی رجعت قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور الزام رکھتے ہیں کہ بورژوا سرمایہ داروں نے اپنی بازی ہرتی دیکھ کر ہٹلر اور مسولینی کو کھڑا کر دیا تھا۔ لیکن یہ اصل حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کسی طبقے یا کسی مخصوص مفاد کے بدنیت ایجنٹ نہیں تھے۔ مارکس اور لینن ہی کی طرح کے لوگ تھے۔ ویسے ہی مخلص، ویسے ہی ذہین، اور ویسے ہی کج فہم۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف جنگ کی زبردست چوٹ نے ان کی قوم کو اس قدر بدحال کر دیا ہے کہ صدیوں کا قومی فخر و ناز خاک میں ملا جاتا ہے۔ دوسری طرف بے قید معیشت کی اندرونی خرابیاں اور اشتراکیت کی اوپری انگیخت قوم کے مختلف عناصر کو آپس ہی میں ایک سخت خونریز اور غارتگر کشمکش میں مبتلا کیے دے رہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایسی تدبیریں سوچنی شروع

کیں جن سے وہ طبقاتی اغراض کی اندرونی نزاع کو دُور کر کے اپنی قومی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بھی بچالیں اور اپنی قوم کی معاشی، تمدنی اور سیاسی طاقت کو مضبوط کر کے از سرِ نو اس کی عظمت کا سکہ بھی دنیا میں بٹھا دیں لیکن وہ اور ان کے حامی اور پیرو، سب کے سب مغربی ذہن کی اُن ساری کمزوریوں کے وارث تھے جنھیں ہم تاریخ میں مسلسل کار فرما دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اپنے پیش رو مفکرین و مدبرین کی طرح انھوں نے بھی یہی کیا کہ چند صداقتوں کو لے کر ان کے اندر بہت سے مبالغے کی آمیزش کی، چند صداقتوں کو ساقط کر کے ان کی جگہ چند حماقتیں رکھ دیں، اور اس ترکیب سے ایک نیا غیر متوازن نظام زندگی بنا کھڑا کیا۔

آئیے اب ذرا اس مرکب کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں کہ اس میں صحیح اور غلط کی آمیزش کس طرح کس تناسب سے تھی اور اس کے نفع و نقصان کی میزان کیا رہی۔ اگرچہ جنگِ عظیم دوم میں شکست کھا کر یہ دونوں توأم بھائی بظاہر مر چکے ہیں، لیکن ان کی پھیلائی ہوئی بہت سی بدعتیں بدلے ہوئے ناموں سے مختلف ملکوں میں اب بھی موجود ہیں اور خود ہمارا ملک بھی ان بلاؤں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے فاشیت اور نازیت کے اجزاءِ صالح اور اجزاءِ فاسد کی نشان دہی اب بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی جنگ سے پہلے تھی۔

صحیح اور مفید کام

فاشی اور نازی حضرات اشتراکیوں کے اس خیال کو رد کر دینے میں بالکل حق بجانب تھے کہ ایک معاشرے اور ایک قوم کے زمیندار و سرمایہ دار طبقات اور محنت پیشہ طبقات کے درمیان صحیح اور فطری تعلق صرف نفرت، عناد اور جنگ ہی

کا تعلق ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اصل چیز طبقہ نہیں بلکہ معاشرہ اور قوم ہے جس کے مختلف اجزاء و اعضاء اپنے مجموعہ کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے ہیں ان کے درمیان حقیقی تعلق دشمنی اور جنگ و پیکار کا نہیں بلکہ موافقت اور تعاون اور تعامل کا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ سب مل کر سب کے لیے اشیائے ضرورت پیدا کریں اور اجتماعی پیداوار کو بڑھا کر قومی دولت اور طاقت میں اضافہ کریں۔ اس موافقت اور تعاون میں اگر کوئی کمی یا خلل ہو تو اسے دُور ہونا چاہیے نزاع و اختلاف ہو تو اسے رفع ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ وہ بڑھے اور ایک ہی معاشرے کے اجزاء ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تُل جائیں۔

انھوں نے اشتراکیت کے اس نظریہ کو بھی بجا طور پر رد کر دیا کہ اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی ملکیت اور ذاتی نفع طلبی بجائے خود کوئی نقصان دہ چیز ہے جسے ختم ہو جانا چاہیے۔ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ یہ دونوں چیزیں خود اجتماعی مفاد ہی کے لیے مفید اور ضروری ہیں بشرطیکہ یہ بے قید عیشت کی طرح غیر محدود نہ ہوں بلکہ کچھ حدود کے ساتھ محدود کر دی جائیں۔ انھوں نے کہا کہ افراد کو اپنے نفع کے لیے جد و جہد کرنے کا حق تو ضرور ہے مگر اس حق کا استعمال اجتماعی مفاد کے تحت اور اس کے مطابق ہونا چاہیے نہ کہ اس کے خلاف۔ مرکزی مالیات (High Finance) معدنیات، جہاز سازی و جہاز رانی، سامانِ جنگ کی صنعت اور ایسے ہی دوسرے بڑے کاروبار (Big Business) انفرادی ملکیت میں نہ رہنے چاہییں۔ ایسے اجاروں کو بھی ختم ہونا چاہیے جن میں اجتماعی مفاد کو شخصی مفاد پر قربان کیا گیا ہو۔ تجارت میں سٹے کو قطعی بند ہونا چاہیے۔ قرض و استقراض کے

نظام میں سے سُود کو بالکل ساقط ہو جانا چاہیے[1]۔ اور کاروبار کو ایسے قواعد و ضوابط کا پابند ہونا چاہیے جو اس سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کے مفاد سے مطابقت رکھتے ہوں نہ کہ صرف ایک گروہ کے مفاد سے۔ اس کے بعد اگر ایک کارخانہ دار قیمتیں مناسب رکھتا ہے، مال اچھا تیار کرتا ہے، اپنے مزدوروں کو خوشحال اور خوشدل رکھتا ہے، اپنی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اپنی ان خدمات کے معاوضے میں جائز حدود کے اندر رہ کر منافع لیتا ہے تو وہ آخر کس جُرم کا مرتکب ہے کہ خواہ مخواہ اسے دشمن جماعت قرار دیا جائے؟

انھوں نے اپنی وسیع المشربی کے اس نظریہ کو بھی بالکل بجا طور پر رد کر دیا کہ حکومت صرف پولیس اور عدالت کے فرائض انجام دے اور معاشی زندگی کے کاروبار سے کچھ غرض نہ رکھے۔ انھوں نے کہا کہ قومی معیشت کے مختلف عناصر کے درمیان ہم آہنگی اور توافق اور تعاون پیدا کرنا اور نزاع و کشمکش کے اسباب کو دُور کرنا قومی ریاست کے فرائض میں سے ہے۔ انھوں نے ایک طرف ہڑتال کو اور دوسری طرف کارخانے بند کرنے کو از روئے قانون ممنوع ٹھیرایا۔ اجیروں اور مستاجروں کی مشترک کونسلیں بنائیں۔ ان کے درمیان حقوق و فرائض انصاف کے ساتھ مقرر کرنے کی کوشش کی اور ان کے جھگڑوں کو چکانے کے لیے باہمی گفت و شنید پھر پنچایت اور بالآخر عدالتی فیصلہ کا ایک باقاعدہ نظام مقرر کر دیا۔

---

[1] اگرچہ یہ لوگ سُود کو عملاً بند نہ کر سکے، اور خود اسٹیٹ نے قرض لے کر اس پر سُود ادا کیا، لیکن نازی اور فاشی دونوں سُود کو بُرا جانتے تھے اور اسے بند کرنے کے قائل تھے۔

انھوں نے سرمایہ داری نظام کی اس خرابی کو دُور کرنے کی کوشش کی کہ جو لوگ بیکار ہوتے ہیں یا ناکارہ ہوجاتے ہیں ان کی خبرگیری کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس طرح بے وسیلہ لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دینے کے جو نقصانات ہوسکتے ہیں، نازیوں اور فاشیوں نے ان کو محسوس کیا اور بہت وسیع پیمانے پر سوشل انشورنس کا اہتمام کیا جس کے ذریعہ سے بیماری، بڑھاپے، بیکاری اور حادثات کی صورت میں کارکنوں کو مدد دی جاتی تھی۔ نیز انھوں نے ماؤں اور بچوں کی نگہداشت، فلاح اطفال، اپاہجوں اور معذوروں کی خبرگیری، جنگ میں ناکارہ ہوجانے والوں کی امداد، لاوارث بوڑھوں کی دیکھ بھال اور ایسے ہی دوسرے امورِ خیریہ کے لیے عظیم الشان ادارے قائم کیے۔ جنگ سے پہلے جرمنی میں اس طرح کا جو ادارہ قائم تھا اس نے تقریباً ۵ لاکھ افراد کو سنبھال رکھا تھا۔

انھوں نے بے قید معیشت کے اس عیب کو دُور کرنے کی طرف بھی توجہ کی کہ سارا معاشی کاروبار بغیر کسی نقشے اور منصوبے اور ہم آہنگی کے چلتا رہتا ہے اور اس کی وجہ سے معاشی وسائل پوری طرح سے استعمال نہیں ہوتے اور جتنے کچھ استعمال ہوتے ہیں ان میں توازن نہیں ہوتا۔ اِس خرابی کو دُور کرنے کے لیے انھوں نے قومی معیشت کی رہنمائی اور تنظیم و توفیق (Co-ordination) کا کام ریاست کے ہاتھ میں لے لیا، معاشی زندگی کے تمام شعبوں کی کونسلیں بنائیں، اور ایک منضبط اور منظم طریقے سے پیداوار کے وسائل اور قوتوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انھوں نے بے روزگاری کا خاتمہ کر دیا[1]، پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ کیا اور

---

[1] ۱۹۳۳ء میں جب نازی پارٹی برسرِ اقتدار آئی تھی تو جرمنی میں تقریباً ۸۰ لاکھ آدمی بیکار تھے مگر

مختلف شعبوں میں ہموار ترقی کی۔

حماقتیں اور نقصانات

یہ تھیں فاشیت اور نازیت کی برکات۔ مگر ان برکات کے لیے اٹلی اور جرمنی کو قیمت کیا دینی پڑی؟

نازی اور فاشی حضرات نے طبقاتی منافرت کے افتراق انگیز اثرات کا مداوا قوم پرستی کی شراب سے نسلی فخر و غرور کے جنون سے، دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور غیظ و غضب کے اشتعال سے اور عالمگیری و جہاں کشائی کے جذبات سے کیا جس کا انجام کبھی کسی قوم کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوتا ہے۔ قوموں کا صحیح نشوونما اور اٹھان اگر ہو سکتا ہے تو صرف تعمیری اخلاقیات اور ایک صالح نصب العین ہی کے بل پر ہو سکتا ہے۔ جو لیڈر اس طریقہ کو چھوڑ کر قومیت کے استحکام و ترقی کے لیے نفرت اور خطرے اور اشتعال ہی کو مستقل وسائل کے طور پر استعمال کرنے لگتے ہیں وہ اپنی قوم کا مزاج بگاڑ دیتے ہیں اور ایسے ذرائع سے اٹھی ہوئی قوم ایک نہ ایک دن بری طرح ٹھوکر کھا کر گرتی ہے۔

انھوں نے اپنی قوم کی بھلائی کے لیے معاشی و تمدنی اصلاح کا جو پروگرام بنایا اس کو سیدھے سیدھے معقول طریقے سے نافذ کرنے کے بجائے ایک نہایت لغو اجتماعی و سیاسی فلسفہ گھڑا جو بے شمار مبالغہ آفرینیوں اور عملی حماقتوں کا مرکب تھا۔ انھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ "فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں"۔

م۔ چند سال بعد نوبت یہ آگئی کہ جرمنی کو کارکنوں کی کمی کا شکوہ تھا۔

پھر اس پر یہ ردا چڑھایا کہ ربطِ ملت میں جو فرد شامل نہیں ہوتا یا اس ربط کے قیام میں مانع ہوتا ہے اُسے واقعی کچھ نہ رہنا چاہیے۔ اس کے بعد استدلال کی عمارت یوں کھڑی کی کہ ربطِ ملت کا اصل مظہر ہے قومی ریاست۔ اور قومی ریاست کے ضبط و استحکام کا انحصار ہے اس پارٹی پر جو قومی وحدت اور ترقی کا یہ پروگرام لے کر اٹھی ہے لہٰذا " جرمن ہے تو نازی پارٹی میں آ " اور " اٹالین ہے تو فاشسٹ ہو جا "۔ اس طرح قوم اور ریاست اور حکومت اور حکمران پارٹی کو ایک ہی چیز بنا ڈالا گیا ہر اس شخص کو قوم اور قومی ریاست کا دشمن قرار دے دیا گیا جس نے برسرِ اقتدار پارٹی سے کسی معاملہ میں اختلاف کی جرأت کی۔ تنقید اور بحث اور آزادیٔ رائے کو ایک خطرناک چیز بنا دیا گیا۔ ایک پارٹی کے سوا ملک میں کوئی دوسری پارٹی زندہ نہ رہنے دی گئی۔ انتخابات محض ایک کھیل بن کر رہ گئے۔ قوم کے دماغ پر ہر طرف سے مکمل احاطہ کرنے کے لیے پریس، ریڈیو، درسگاہ، آرٹ، لٹریچر اور تھیٹر کو بالکل حکمران پارٹی کے قبضہ میں لے لیا گیا تاکہ قوم کے کانوں میں ایک آواز کے سوا کوئی دوسری آواز پہنچنے ہی نہ پائے یہی نہیں بلکہ ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں کہ اوّل تو غالب پارٹی کی رائے کے سوا کوئی رائے دماغوں میں پیدا ہی نہ ہو، اور اگر کچھ نالائق دماغ ایسے نکل آئیں جو خداوندانِ ملت کے خیالات سے مختلف خیالات رکھتے ہوں تو یا تو ان کے خیالات ان کے دماغ ہی میں دفن رہیں یا پھر ان کے دماغ زمین میں دفن ہو جائیں۔

انھوں نے بظاہر یہ بڑا ہی معقول سا نظریہ اختیار کیا کہ اجتماعی زندگی میں کوئی مرکزی منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے انتشار، بدنظمی اور باہمی کشمکش بھی پیدا

ہوتی ہے اور مجموعی طور پر طاقت اور ذرائع کا ضیاع بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ لہٰذا پوری قومی زندگی کو منظّم ہونا چاہیے۔ اور ایک مرکزی حکم کے تحت ایک مرکزی طاقت کے مقرر کیے ہوئے نقشے پر تمام افراد کو بالکل ایک مشین کے پرزوں کی طرح باقاعدہ کام کرنا چاہیے۔ انھوں نے خیال کیا کہ پیداوار اور ترقی اور خوشحالی کو تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانے کی یہی ایک صورت ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کے مطابق انھوں نے سارے ملک کی زندگی کو اس کے تمام معاشی، تمدنی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی پہلوؤں سمیت ایک ضابطے میں کس ڈالا اور ایک تگے بندھے منصوبے پر چلانا شروع کر دیا۔ ان کے نظامِ زندگی میں سب کچھ مقرر تھا۔ ہر شخص اور ہر ادارے کا کام مقرر، اُجرتیں مقرر، قیمتیں مقرر، حقوق اور فرائض مقرر، قوتوں اور قابلیتوں کے استعمال کی صورتیں مقرر۔ سرمائے اور وسائل و ذرائع کے مصرف مقرر، حتیٰ کہ فکر و خیال اور جذبات و رجحانات کی راہیں تک مقرر۔ اور ان سب کے لیے کئی کئی سال کے پروگرام مقرر۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے محض قوم کی خاطر اتنی تکلیفیں اٹھا کر اور اتنی مغز زنی کر کے پوری قومی زندگی کے اتنے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی ہو، وہ بھلا کیسے برداشت کر لیتے کہ ایک شخص آ کھڑا ہو اور ان پر تنقید کر کے دماغوں میں انتشار پھیلائے، جن کارکنوں کو کام میں منہمک ہونا چاہیے انہیں بحث میں اُلجھا دے، اور اتنی محنت سے بنائے ہوئے منصوبے پر سے عوام الناس کا اطمینان اور اعتماد ختم کر دے۔ پس یہ "منصوبہ بند" زندگی کی اندرونی منطق ہی کا تقاضا تھا جس کی بنا پر وہ تنقید اور رائے زنی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور اس بات پر مُصر تھے کہ جس کو بولنا ہو وہ ہمارے پروگرام کی

موافقت میں ہوے ورنہ اپنا منہ بند رکھے متصوبہ بندی ہوگی تو زبان بندی اور خیال بندی بھی ضرور ہوگی۔ اختلاف رائے بند، بحث بند، تنقید بند، مواخذہ اور احتساب بند، بلکہ چند خاص دماغوں کے سوا ساری قوم کے دماغوں کا سوچنا بھی بند۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نازی اور فاشی مسلک جو کچھ دیتے ہیں کیا وہ اس قیمت پر لینے کے قابل ہے؟ ساری قوم میں چند انسان تو ہوں انسان، اور باقی سب بن کر رہیں مویشی، بلکہ ایک مشین کے بے جان پُرزے۔ اس قیمت پر یہ اطمینان ہوتا ہے کہ سب کو چارہ برابر ملتا رہے گا!

نظامِ سرمایہ داری کی اندرونی اصلاحات

اب ہمیں ایک نظر یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ جن ممالک میں وسیع المشرب جمہوریت کی جڑیں مضبوط تھیں۔ انھوں نے نظامِ سرمایہ داری کو اس کی اصل بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے اس کے اندر کس قسم کی اصلاحات کیں اور اس سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، اٹھارویں صدی میں بورژوا طبقہ ایک طرف اپنے معاشی مفاد کے لیے بے قید معیشت کے اصول پیش کر رہا تھا اور دوسری طرف یہی طبقہ اپنے سیاسی مفاد کے لیے جمہوریت، مساوات اور حاکمیتِ عوام کا صور پھونک رہا تھا، آزادیِ رائے، آزادیِ ضمیر، آزادیِ تحریر و تقریر اور آزادیِ اجتماع کے حقوق کا مطالبہ کر رہا تھا حتیٰ کہ اس بات پر بھی زور دے رہا تھا کہ ناقابلِ برداشت جبر کے مقابلہ میں رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا حق ہے۔ ابتداءً میں جب

یہ لوگ ان نظریات کو پیش کر رہے تھے تو ان کے پیشِ نظر شاہی خاندان، مالکِ زمین اور اربابِ کلیسا تھے۔ سامنے وہ ان کو دیکھتے تھے اور مقابل میں صرف اپنے آپ کو پاتے تھے اس لیے ان کو بالکل یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ایک طرف جس بے قید انفرادیت پر معاشی نظام کی عمارت جس جمہوریت اور تمدنی مساوات پر تعمیر کر رہے ہیں، یہ دونوں کبھی ایک دُوسرے کی ضد ثابت ہوں گی اور آپس میں ایک دوسرے سے متصادم ہو جائیں گی۔

جب ان کی جدوجہد سے نئے جمہوری نظام نے مختلف ممالک میں جنم لینا شروع کیا اور ووٹ کا حق مالکانِ زمین سے گزر کر تاجروں، کارخانہ داروں اور ساہوکاروں تک وسیع ہوا تو پھر یہ ممکن نہ رہا کہ کسی دلیل سے اس کو مزدوروں اور کاشتکاروں اور محنت پیشہ عوام تک پہنچنے سے روکا جا سکے۔ بورژوا حضرات نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ان کی اپنی ہی منطق ان کے خلاف کام کرنے لگی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ان کو اسی طرح عوام کا حقِ رائے دہی تسلیم کرنا پڑا جس طرح پہلے مالکانِ زمین کو خود اُن کا حق ماننا پڑا تھا۔ پھر کسی دلیل سے یہ بات بھی معقول ثابت نہ کی جا سکتی تھی کہ مستاجروں کے لیے تو اپنی تنظیم جائز ہو اور اجیروں کے لیے جائز نہ ہو، یا مستاجر تو اپنی شرائط اپنی متحدہ طاقت سے اجیروں پر عاید کریں مگر اجیر اپنی جماعت کے زور سے اپنی شرائط منوانے کے مجاز نہ ہوں۔ اس طرح رفتہ رفتہ مزدوروں اور ملازموں کا یہ حق بھی تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنی انجمنیں بنائیں۔ اکیلے اکیلے نہیں بلکہ مجموعی طاقت سے اُجرتوں اور تنخواہوں اور شرائطِ کار کے لیے سَودا چکائیں، اپنی شکایات رفع کرانے کے لیے ہڑتال کا حربہ استعمال کریں

اور ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے پہرہ لگائیں۔

انیسویں صدی کے خاتمہ کے ساتھ سیاست کا یہ پرانا نظریہ بھی ختم ہونے لگا کہ ریاست کا کام فقط شخصی آزادیوں کی حفاظت ہے اور قومی زندگی میں ریاست کے ایجابی فرائض کچھ بھی نہیں ہیں۔ اب اس کی جگہ یہ احساس خود بخود اُبھرنا شروع ہوا کہ ایک جمہوری ریاست تو خود باشندگانِ ملک ہی کی متفقہ مرضی کی مظہر ہوتی ہے اور جمہور اپنی ہی سیاسی طاقت کو ریاست کی شکل میں مرتکز اور منظم کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ پُرانی شاہی حکومتوں کی طرح اب جمہوری حکومت کے دائرۂ عمل کو بھی محدود رکھنے پر اصرار کیا جائے۔ جمہوری حکومت کے فرائض محض سلبی نہ ہونے چاہییں بلکہ اسے ایجابی طور پر اجتماعی مفاد کے لیے کام کرنا چاہیے اور اگر معاشرے میں بے انصافیاں پائی جاتی ہوں تو قانون سازی اور انتظامی مداخلت، دونوں کے ذریعہ سے اس کو ان کا تدارک کرنا چاہیے۔

حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ یکایک جنگِ عظیم اوّل پیش آگئی، پھر روس میں وہ اشتراکی انقلاب برپا ہوا جس نے بورژوا طبقہ کے زن بچے تک کو کولہو میں پیل دیا، پھر جرمنی اور اٹلی میں اس کا ردِّ عمل فاشیت اور نازیت کی شکل میں رُونما ہوا جس نے بورژوا اور محنت پیشہ عوام، سب کو ایک سخت جابرانہ نظام میں کس دیا۔ ان واقعات نے سرمایہ داری کو اچھا خاصا "روشن خیال" بنا دیا اور وہ کچھ تو عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے دباؤ سے، اور کچھ اپنی مرضی سے پرانی بے قید معیشت کے نظام میں حسبِ ذیل تغیرات قبول کرتی چلی گئی۔

(۱) ہر شعبۂ معیشت میں مزدوروں اور ملازموں کی اپنی تنظیمات کو باقاعدہ

تسلیم کرلیا گیا ہے جو ان کی طرف سے بات کرنے کی مجاز ہیں۔اس کے ساتھ ایک حد تک رسمی یا قانونی طور پر بعض ایسی عملی تدبیروں کو بھی جائز و معقول مان لیا گیا ہے جنہیں مزدوروں اور ملازموں کی انجمنیں اپنے مطالبات منوانے اور ان کی خاطر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کرسکتی ہیں۔اس طرح اگرچہ سرمایہ و محنت کی کشمکش ختم تو نہیں ہوئی لیکن محنت اب سرمایہ کے مقابلہ میں اتنی بے بس بھی نہیں رہی ہے جتنی بے قید معیشت کے دور میں تھی۔

(۲) اُجرتوں میں اضافہ، اوقاتِ کار میں کمی، کام کرنے کے حالات میں نرمی، عورتوں اور بچوں سے محنت لینے پر پابندی، مزدور کی جان اور صحت کی نسبتاً زیادہ پروا، اس کے گھر اور ماحول کو پہلے سے بہتر بنانے کی کوشش، جسمانی نقصان پہنچ جانے کی صورت میں اس کی کچھ نہ کچھ تلافی، اور پھر سوشل انشورنس کی بھی بعض اسکیموں کی ترویج، یہ سب کچھ اگرچہ اس حد تک نہیں ہوا جتنا ہونا چاہیے تھا، لیکن بہرحال اب مزدوروں اور نچلے طبقے کے ملازموں کا حال اتنا خراب بھی نہیں ہے جتنا پہلے تھا۔

(۳) حکومت کی یہ حیثیت تسلیم کرلی گئی ہے کہ وہ محنت اور سرمایہ کے درمیان حَکم بنے۔نیز ان کی باہمی کشمکش کو دُور کرنے اور ان کے جھگڑے چکانے کی مختلف قانونی صورتیں بھی مقرر کردی گئی ہیں۔یہ چیز اگرچہ اس حد تک نہیں پہنچی ہے کہ ہر شعبۂ معیشت میں اجیر اور مستاجر کے درمیان حقوق و فرائض کا منصفانہ تعین کردیا جاتے، اور ابھی معاشی نزاعات میں عدالتی فیصلہ دینے کا کام بھی حکومت نے پوری طرح سے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا ہے، لیکن اصولاً حکومت کا یہ منصب تسلیم

کر لیا گیا ہے۔

(۴) یہ اصول بھی مان لیا گیا ہے کہ انفرادی نفع اندوزی پر ایسی پابندیاں عائد ہونی چاہییں جن سے وہ اجتماعی مفاد کے خلاف نہ ہونے پائے، اور یہ کہ ایسی پابندیاں عائد کرنا حکومت ہی کے فرائض میں سے ہے۔

(۵) بعض ایسی معاشی خدمات کو اکثر حکومتوں نے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جو یا تو انفرادی کاروبار کے بس کی نہیں ہیں، یا جنہیں افراد کے قبضہ میں دینا مجموعی مفاد کے خلاف ہے۔ مثلاً ڈاک اور تار اور وسائل حمل و نقل کا انتظام۔ سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر اور ان کو درست حالت میں رکھنا۔ جنگلات کی پرداخت اور ان کا نظم و نسق۔ آب رسانی اور آب پاشی۔ برق آبی کی پیدائش اور تقسیم۔ روپے کا کنٹرول۔ اس کے علاوہ حکومتوں نے عموماً معدنیات کو بھی اپنے اجارے میں لے لیا ہے اور بعض بڑی بڑی صنعتوں کو اپنے انتظام میں چلانا شروع کر دیا ہے۔

(۶) تھوڑی تھوڑی آمدنیاں رکھنے والے ملازموں اور مزدوروں کے لیے ایسے مواقع پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ وہ تھوڑا تھوڑا پس انداز کر کے تجارتی اور صنعتی کمپنیوں میں کم قیمت کے حصے خرید لیں اور بعض جگہ ایسی صورتیں بھی اختیار کی گئی ہیں کہ خاص خاص قواعد کے مطابق ملازموں اور مزدوروں کی اُجرتوں کا ایک حصہ ان کو نقد ملتا جاتا ہے اور ایک حصہ ان کی طرف سے کمپنی کے سرمایہ میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح بکثرت محنت پیشہ کارکن اس کمپنی یا کارپوریشن کی ملکیت میں حصہ دار بھی ہو گئے ہیں جن کے اندر وہ مزدوری یا ملازمت کر رہے ہیں۔ بعض بڑے بڑے مشہور کارخانوں میں ۸۰ فی صدی اور ۹۰ فی صدی مزدور اور ملازم شریک

ملکیت ہو چکے ہیں اور اقساط پر حصے خریدنے کی آسانیاں حاصل ہونے کی وجہ سے کارخانوں میں ان کی حصہ داری کا تناسب برابر بڑھتا جارہا ہے۔

وہ خرابیاں جو اب تک نظام سرمایہ داری میں باقی ہیں

لیکن ان تمام تغیرات، ترمیمات اور اصلاحات کے باوجود ابھی تک نظام سرمایہ داری کے بنیادی عیوب جوں کے توں باقی ہیں۔

ابھی تک بیروزگاری کا استیصال نہیں ہو سکا ہے۔ بلکہ زمانہ جنگ کے سوا دوسرے تمام حالات میں یہ ایک مستقل مرض ہے جو نظام سرمایہ داری کے تحت سوسائٹی کو لگا رہتا ہے۔ امریکہ جیسے ملک میں جس کی صنعت و حرفت اور پیداوار دولت آسمانِ عروج کو پہنچی ہوئی ہے، جنگی مشاغل کم ہوتے ہی ۳۲ لاکھ سے زیادہ آدمی بیکار ہو گئے۔ اپریل و مئی ۱۹۴۹ء کے درمیان اُن کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۳۵ لاکھ سے اوپر ہو گئی، اور جون میں ۴۰ لاکھ تک جا پہنچی۔ تجارت و صنعت کی گرم بازاری کا زمانہ ہو یا سرد بازاری کا زمانہ بے روزگاری، کم و بیش ہر حال میں نظام سرمایہ داری کی جزوِ لاینفک بنی رہتی ہے۔

ابھی تک وہ عجیب و غریب معمّا جوں کا توں بے حل پڑا ہوا ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک طرف تو کروڑہا انسان ضروریاتِ زندگی کے حاجت مند اور اسبابِ عیش کے خواہش مند موجود ہیں، بے حد و حساب قدرتی وسائل موجود ہیں جنہیں استعمال کر کے مزید اشیاء تیار کی جا سکتی ہیں، اور لکھوکھا آدمی ایسے موجود ہیں جنہیں کام پر لگایا جا سکتا ہے، لیکن دوسری نظامِ سرمایہ داری دنیا

کی ضرورت اور امکانی کھپت سے بہت کم جو مال تیار کرتا ہے وہ بھی بازار میں پڑا رہ جاتا ہے کیونکہ لوگوں کے پاس اس کو خریدنے کے لیے روپیہ نہیں ہے اور جب تھوڑا مال ہی نہیں نکلتا تو مزید آدمیوں کو کام پر لگانے اور قدرتی وسائل کو استعمال کرنے کی ہمت نہیں کی جا سکتی، اور جب آدمی کام پر ہی نہیں لگائے جاتے تو ان میں قوت خریداری پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

یہی نہیں بلکہ ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی علیٰ حالہ قائم ہے کہ ہر سال بہت بڑی مقدار میں تیار کیا ہوا مال اور پیدا کیا ہوا غلہ اور پھل اور دوسرا سامان بازار میں لانے کے بجائے قصداً برباد کر دیا جاتا ہے۔ درآنحالیکہ کروڑوں آدمی ان اشیاء کے طالب موجود ہوتے ہیں۔ سرمایہ داران چیزوں کو غارت کر دینا اور اس غارت گری پر لاکھوں روپے صرف کر دینا زیادہ پسند کرتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ انہیں بازار میں لا کر ان کی قیمتیں گھٹائے اور انہیں سستے داموں حاجتمند انسانوں تک پہنچائے۔

ابھی تک نظام سرمایہ داری کا یہ عیب بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ ریاست، سوسائٹی، مالدار طبقہ، غرض کوئی بھی اپنے آپ کو ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی کفالت اور دستگیری کا ذمہ دار نہیں سمجھتا جو قابل کار ہونے کے باوجود بیکار ہوں، یا ابھی قابل کار نہ ہوئے ہوں، یا مستقل یا عارضی طور پر ناکارہ ہو گئے ہوں۔ اب بھی علاج کا مستحق وہی بیمار ہے جس کی جیب میں پیسہ ہو۔ اب بھی تعلیم و تربیت کا مستحق وہی یتیم ہے جس کا باپ انشورنس پالیسی چھوڑ مرا ہو۔ اب بھی حوادث میں گر کر وہی شخص اُٹھ سکتا ہے جو پہلے اچھے دن دیکھ چکا ہو اور ان دنوں میں

اُس نے خود ہی بُرے وقت کے لیے سہارے کا سامان کر رکھا ہو۔ غرض ابھی تک مصیبت زدہ، حاجت مند، بے وسیلہ آدمی بجائے خود کسی کی بھی ذمہ داری میں نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں اتفاقاً کسی کو کچھ مدد مل جائے۔

ابھی تک نظامِ سرمایہ داری کا یہ عیب بھی دُور نہیں ہوا کہ مصنوعی طور پر قیمتیں چڑھائی جاتی ہیں اور باقاعدہ منصوبے بنا بنا کر بعض اشیاء کا قحط پیدا کیا جاتا ہے۔ غائب سودے اور تجارتی قمار بازی کے مختلف طریقے اب بھی اجتماعی معیشت کے مزاج کو شب و روز درہم برہم کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اب بھی کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے کہ اگر وہ ایک بڑا سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں تو اپنے ذاتی نفع کے لیے جو مال چاہیں اور جتنا چاہیں تیار کر لیں اور معاشرے پر اس کو ٹھونسنے کی جس طرح چاہیں کوشش کریں، خواہ معاشرے کو اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، بلکہ اس کے لیے وہ چیز مضر ہی کیوں نہ ہو۔ اب بھی یہ عجیب صورتِ حال رات دن مشاہدے میں آ رہی ہے کہ معاشرے کی نہایت اہم اور سخت ضرورتیں تو رُکی پڑی ہیں مگر محنت اور سرمایہ عیش و عشرت کے سامانوں پر، شہواتِ نفس کے کھلونوں پر اور خوشحالی کے چونچلوں پر بے تحاشا صرف ہو رہا ہے۔ اب بھی صنعت اور تجارت کے بادشاہ اور مالیات کے شہنشاہ اپنی اغراض کے لیے وہ کھلی اور چھپی ریشہ دوانیاں کیے جا رہے ہیں جو بین الاقوامی کشمکش، رقابت اور جنگ کی موجب ہوتی رہتی ہیں۔

ابھی تک نظامِ سرمایہ داری میں معاشرے اور ریاست کی تکمیل سا ہوکار دھنیک کے ہاتھ میں ہے اور وہ ساری اجتماعی قدروں کو شرحِ سُود کے معیار پر جانچ رہا ہے اور اسی محور پر ان کو گھما رہا ہے۔ یہ فیصلہ وہ کرتا ہے کہ سرمایہ کو کن

کاموں پر خرچ ہونا چاہیے اور کن پر نہ ہونا چاہیے اور اس فیصلے کے لیے اس کے پاس معیار یہ نہیں ہے کہ معاشرے کے لیے ضروری اور مفید کون سے کام ہیں بلکہ یہ ہے کہ بازار کی شرح سُود کے برابر یا اس سے زائد نفع کن کاموں میں ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے اگر آب رسانی کی بہ نسبت شراب رسانی زیادہ نفع آور ہوگی تو وہ بلا تامل عوام الناس کو صاف پانی کے لیے ترستا چھوڑ کر عیاشوں کو شراب پلانے کی فکر میں لگ جائے گا۔

ابھی تک نظامِ سرمایہ داری کو وہ بیماری بھی لگی ہوتی ہے جسے "کاروبار کا چکر" (Trade Cycle) کہتے ہیں، جس میں ہر چند سال کی گرم بازاری کے بعد دنیا کی معیشت پر کساد بازاری کے دَورے پڑتے رہتے ہیں۔ کاروبار کی دنیا پوری تیز رفتاری کے ساتھ مزے سے چل رہی ہوتی ہے کہ یکایک تجار محسوس کرتے ہیں کہ جو مال ان کے گوداموں میں آرہا ہے وہ مناسب رفتار سے نکل نہیں رہا۔ وہ ذرا فرمائشیں روکتے ہیں۔ صنّاع یہ حال دیکھ کر ذرا مال کی تیاری سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ سرمایہ دار خطرے کی اس علامت کو بھانپتے ہی قرض سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور پہلے کا دیا ہوا بھی واپس مانگنے لگتا ہے۔ کارخانے بند ہونے شروع ہوتے ہیں۔ بے روزگاری بڑھتی ہے۔ قیمتیں گرنی شروع ہوتی ہیں۔ تاجر اور گاہک مزید قیمتیں گرنے کی امید پر فرمائش اور خریداری سے ہاتھ روکتے ہیں۔ چلتے ہوئے کارخانے بھی پیداوار کم کر دیتے ہیں۔ بے روزگاری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ حکومتیں آمدنی گھٹتی دیکھ کر مصارف میں تخفیف کرنے لگتی ہیں۔ کساد بازاری میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر قدم جو پیچھے ہٹتا ہے، کئی قدم اور پیچھے ہٹنے کا سبب

بنتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب غلطی اور تُکلّی دیوالہ کی سرحد قریب آجاتی ہے تو یکایک رُخ بدلتا ہے، آہستہ آہستہ چڑھاؤ شروع ہو جاتا ہے، اور پھر گرم بازاری کا دَور آجاتا ہے۔ یہ چکر نظام سرمایہ داری کے لیے ایک مستقل مرض بن چکا ہے جس کا ابھی تک کوئی علاج شروع نہیں ہُوا۔

یہ اور دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے عیوب آج کی مقید اور اصلاح یافتہ سرمایہ داری میں بھی اسی طرح موجود ہیں جس طرح اُنیسویں صدی کی بے قید اور بداطوار سرمایہ داری میں پائے جاتے تھے۔ یہ اس بات کا کھُلا ثبوت ہے کہ جمہوریت نے اس نظام کے اصل اسباب خرابی کو سمجھ کر حکمت کے ساتھ انھیں دُور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی ہے، بلکہ جو کچھ ہُوا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جتنا جتنا محنت پیشہ عوام کا دباؤ پڑتا گیا ہے، یا اشتراکیت کا خطرہ بڑھتا گیا ہے، بوژوا طبقے اپنے طریقوں میں ایسی ترمیمات کرتے چلے گئے ہیں جن سے عوام کی شکایات اس حد تک ہلکی پڑ جائیں کہ اشتراکی لوگ ان سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔

تاریخ کا سبق

پچھلے صفحات میں جو تاریخی بیان پیش کیا گیا ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے ایک عام ناظر کے سامنے کئی باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ روشن ہو جائیں گی۔ سب سے پہلے تو وہ ان مسائل اور ان پیچیدگیوں کو صاف پہچان جائیگا جو مغرب کی تاریخ اور ہماری موجودہ اجتماعی زندگی میں مشترک ہیں وہ دیکھے گا کہ یہاں نظام جاگیرداری بھی اپنی بہت سی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے اور جدید سرمایہ داری بھی اپنے بہت سے عیوب کے ساتھ جنم لے چکی ہے۔ کچھ بیماریاں ہم نے اپنے دورِ انحطاط سے میراث میں پائی ہیں اور کچھ مغرب کے صنعتی انقلاب اور نظامِ سرمایہ داری کے جلو میں ہم تک پہنچی ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ یہاں کوئی پاپائیت اور کوئی کلیسائی نظام موجود نہیں ہے۔ نہ کوئی ایسا مذہبی طبقہ (Priest Class) موجود ہے جس کا صاحبِ فضل طبقے سے گٹھ جوڑ ہو اور وہ خدا اور مذہب کا نام لے کر بے جا امتیازات اور زبردستی جمائے ہوئے حقوق کی حمایت کرے۔

پھر اس تاریخی مطالعہ سے ناظر کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ہاں کے بوجھ بجھکڑ اپنی سوسائٹی کے مسائل اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے آتے دن

جو طرفہ تجویزیں پیش کرتے رہتے ہیں ان کا شجرۂ نسب کیا ہے۔ یہ جو ہم سنا کرتے ہیں کہ کوئی صاحب "اجتماعی منصوبہ بندی" کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، اور کوئی دوسرے صاحب ملک کے معاشی نظام میں "انقلابی تبدیلیاں" چاہتے ہیں، اور کوئی تیسرے بزرگ فرماتے ہیں کہ زمین کو انفرادی ملکیت سے نکال کر "قومیا"[1] دیا جائے، اور کسی طرف سے آواز آتی ہے کہ ساری کلیدی صنعتیں بھی "قومائی جائیں"۔ اور کوئی عطائیوں کی مجلس بڑے غور و خوض کے بعد یہ نسخہ کیمیا لے کر آتی ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت کو ختم کر دیا جائے، یہ سب وہ نوادرِ حکمت ہیں جو مغرب کے اناڑیوں کی بیاض سے اڑائے گئے ہیں اور اب یہاں وہ سب تجربات ہونا چاہتے ہیں جو روس میں، جرمنی و اٹلی میں اور امریکہ و انگلستان میں ہو چکے ہیں۔ مگر اس معاملہ میں بھی ہماری اور ان کی مماثلت ایک فرق کے ساتھ ہے۔ وہاں کے اناڑی کم از کم مجتہد تو ہیں لیکن یہاں جو حضرات مطب کھول بیٹھے ہیں وہ اناڑی پن کے ساتھ مقلد بھی ہیں۔ مغرب کے اناڑی نقصان ہوتے دیکھیں گے تو نسخے میں کچھ ردّ و بدل کر لیں گے۔ مگر یہاں مغرب سے ہی کسی ردّ و بدل کی اطلاع آ جائے تو بات دوسری ہے ورنہ ڈاکٹر مریض کی آخری ہچکی تک انشاء اللہ ایک ہی نسخہ پلاتا رہے گا۔

ایک اور بات جو مغربی ممالک کی تاریخ تمدن و تہذیب اور داستانِ افکار و اعمال میں آدمی کو نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ پیہم کشمکش، نزاع اور جدال ہے۔ ایک گروہ زندگی کے میدان پر قابض ہو کر اخلاق کو، مذہب کو، قانون کو، رسم و

---

[1] یعنی قومی ملکیت بنا دیا جائے۔

رواج کو، اور تمدن کے سارے نظام کو ایک رُخ پر کھینچ لے جاتا ہے یہاں تک کہ دوسرے گروہوں کے ساتھ بے انصافی کی انتہا ہو جاتی ہے پھر ان مظلوم گروہوں میں سے کوئی ایک اُٹھ کر اس ظالم گروہ سے گتھ جاتا ہے اور اس کے غلط کے ساتھ اس کے صحیح پر بھی خطِ نسخ پھیر دیتا ہے اور فکر و عمل کے پُورے نظام کو پہلی انتہا سے کھینچ کر دُوسری انتہا کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ پھر بے انصافی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد شکوہ و شکایت سے گزر کر نوبت ایک تیسری بغاوت تک پہنچتی ہے اور ضد اور ہٹ دھرمی کا طوفان پھر جھوٹ کے ساتھ سچ کو بھی بہا لے جاتا ہے اور اگلوں سے بھی بڑھ کر ایک اور انتہا پسندانہ نظام قائم ہو جاتا ہے۔ اس طوفان کی تباہ کاریاں دیکھ کر اس کے مقابلے میں ایک جوابی طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے حریف سے کچھ کم انتہا پسند نہیں ہوتا۔ اس کھینچ تان کی وجہ سے مغرب کی تاریخ آدمی کو کچھ اس طرح سفر کرتی نظر آتی ہے جیسے ایک شرابی لڑکھڑاتا ہُوا خط منحنی چل رہا ہو، نہ کہ ایک ہوشمند انسان سویّا علیٰ صراطِ مُستقیم چلا جا رہا ہو۔ ہیگل اور مارکس بیچارے اس منظر کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ انسانی تمدن کے ارتقاء کی فطری چال یہی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب کچھ نتائج ہیں صرف ایک چیز کے اور وہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب مدتہائے دراز سے بغیر ھدیٰ ولا کتابِ منیر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سینٹ پال کے توسّط سے جو عیسائیت ان کو پہنچی تھی اس کا رشتہ شریعت سے پہلے ہی توڑا جا چکا تھا۔ اس کے پاس مسیح علیہ السلام کے چند اخلاقی مواعظ کے سوا کوئی ایسی خدائی ہدایت سرے سے موجود ہی نہ تھی جس پر تمدن و سیاست اور

معیشت کا ایک وسیع نظام تعمیر کیا جا سکتا۔ بائبل کا پرانا عہدنامہ خود بھی ۱۰ فی صدی خدائی ہدایت کے ساتھ ۹۰ فی صدی انسانی کلام کی آمیزش اپنے اندر لیے ہوئے تھا۔ اس لیے اگر بعد میں انھوں نے نیم عقیدت اور نیم بے عقیدگی کے ساتھ اس کی طرف رجوع کیا بھی تو اس سے کچھ بہت زیادہ رہنمائی نہ مل سکی۔ اسلام عین اس زمانے میں یورپ کے سامنے آچکا تھا جبکہ مغربی رومن امپائر کا نظام درہم برہم ہوئے تھوڑی ہی مدت گزری تھی اور دورِ متوسط کی تاریکی کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ لیکن جس یورپ نے دینِ مسیحی کو اس شرط پر قبول کیا تھا کہ شریعت اس کے ساتھ نہ ہو، وہ بھلا اس اسلام کی طرف حصولِ ہدایت کے لیے کیسے توجہ کرتا جو شریعت کے بغیر نرا دین و ایمان پیش کرنے کے لیے کسی طرح تیار ہی نہ تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے، اور کچھ پادریوں کے پھیلائے ہوئے تعصبات کی وجہ سے، یورپ نے اسلام سے بھی کوئی روشنی حاصل نہ کی۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اہلِ مغرب خود ہی اپنی عقل سے اپنے لیے نظامِ زندگی بناتے۔ چنانچہ یہی انھوں نے کیا۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان خالص عقل فیصلے نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل کے ساتھ خواہش کا گمراہ کُن شیطان بھی لگا ہوا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سارے انسان ایک ساتھ مل کر کوئی نظامِ زندگی وضع نہیں کیا کرتے۔ کچھ بیدار مغز لوگ ہی ایک نظام تجویز کرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کا نظام انہی لوگوں کو اپیل کرتا ہے جو ان کے ساتھ ان کے تعصبات میں شریک ہوں۔ یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر یورپ میں وقتاً فوقتاً جتنے نظامِ زندگی بنتے رہے وہ سب غیر متوازن تھے، اور اس عدمِ توازن کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ وہاں ایک پیہم کش مکش اور کھینچ تان

جاری رہتی۔

سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ہم بھی اس دنیا میں بغیر ھدًی ولا کتابٍ منیرٍ ہی ہیں ؟ کیا ہمارے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ قدیم ہندوانہ جاہلیت، اور دورِ متوسط کے مغل نظام اور دورِ حاضر کے فرنگی تمدن نے مل جل کر جن مسائل سے ہم کو دوچار کر دیا ہے اُن کے حل کی وہی صورتیں اختیار کریں جو اشتراکیت، نازیت، فاشیت، اور سرمایہ داری نے مغرب میں اختیار کی ہیں؟ کیا ہمارے پاس بھی کوئی ایسی روشنی موجود نہیں ہے جس کی مدد سے ایک متوازن نظام بنایا جا سکتا ہو؟ جو شخص اسلام کو جانتا ہو وہ ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

اصلی اُلجھن

اسلام کے اصول پر ہم ان مسائل کو کس طرح حل کر سکتے ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ایک مرتبہ واضح طور پر اس اصلی اُلجھن کو سمجھ لیا جائے جس سے اس وقت دنیا دوچار ہے اور ہم کو بھی دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں وہ اُلجھن یہ ہے:

اگر ہم بے قید معیشت کے اصول اختیار کرتے ہیں جن کی رُو سے ہر شخص کو بے روک ٹوک یہ موقع حاصل رہتا ہے کہ جس قدر ذرائع پیداوار کو چاہے اپنے قبضے میں لائے اور جس طرح چاہے اپنے نفع کے لیے سعی و جہد کرے، نیز جن کی رُو سے سوسائٹی میں عدل و توازن قائم کرنے کے لیے صرف مقابلہ و مسابقت اور کسر و انکسار کے خودرو قوانین ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے، تو اس سے

سرمایہ داری نظام کی وہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور ہماری سوسائٹی کی حد تک جاگیرداری نظام کی بھی وہ بہت سی خرابیاں باقی رہ جاتی ہیں، جن کا ذکر اس سے پہلے ہم "نظام جاگیرداری" اور "جدید نظام سرمایہ داری" کے زیرِ عنوان کر چکے ہیں۔

اور اگر ہم انفرادی ملکیت کے طریقے کو ختم کرکے تمام ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ و تصرف قائم کر دیتے ہیں، تو بلاشبہ مذکورہ بالا خرابیوں کا تو بڑی حد تک تدارک ہو جاتا ہے، مگر اول تو یہ بنیادی تغیر ہی جان و مال کی اس بے دریغ بربادی اور مذہب و اخلاق سے اس کھلی بغاوت کے بغیر نہیں ہو سکتا جس کی مثال روس کے اشتراکی انقلاب میں ہم کو ملتی ہے۔ دوسرے اگر بالفرض یہ تغیر پر امن جمہوری طریقوں سے ہو بھی جائے تو اجتماعی ملکیت کا نظام بہرحال انفرادی آزادی کو قطعی ختم کر دیتا ہے۔ جمہوری طریقوں سے سوشلزم قائم کرنا درحقیقت جمہوریت کے ذریعے سے جمہوریت کو ختم کرنا ہے۔ اس لیے کہ جمہوریت تو اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی کہ سوسائٹی میں کم از کم ایک بہت بڑی اکثریت آزاد پیشہ ور لوگوں کی موجود رہے۔ لیکن سوشلزم اس کے برعکس آزاد پیشوں کو ختم کر دیتا ہے۔ معیشت کا جو شعبہ بھی اجتماعی نظام میں لیا جائے گا، اس کے تمام کارکن ایسے ہی ہو جائیں گے جیسے سرکاری ملازم۔ ملازمت پیشہ طبقہ میں جتنی کچھ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل پائی جاتی ہے، ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ یہ طریق کار جتنا جتنا معیشت میں پھیلتا چلا جائے گا، آزادیٔ فکر، آزادیٔ گفتار، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ تحریر، اور آزادیٔ کار کی سرحدیں سکڑتی

چلی جائیں گی، یہاں تک کہ جس روز پوری معیشت پُورے اجتماعی انتظام میں چلی جائے گی اسی روز ملک کی پوری آبادی سرکاری ملازمین میں تبدیل ہوجائے گی۔ اس طرح کے نظام کی عین فطرت یہی ہے کہ جو گروہ ایک مرتبہ برسرِ اقتدار آ جائے گا وہ پھر ہٹایا نہ جا سکے گا۔

اور اگر ہم انفرادی ملکیت کے نظام کو مٹانے کے بجائے صرف اس پر ایک مضبوط سرکاری تسلّط (Government Control) قائم کر دیتے ہیں اور پُوری قومی معیشت کو ایک مرکزی منصوبہ بندی کے مطابق چلاتے ہیں، جیسا کہ فاشیّت اور نازیّت نے کیا، تب بھی نظامِ سرمایہ داری کی بہت سی خرابیوں کا مداوا تو ہوجاتا ہے۔ مگر انفرادی آزادی کے لیے اتنی ضابطہ بندی بھی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اس کے نتائج عملاً وہی کچھ ہیں جو سوشلزم کے نتائج ہیں۔

اور اگر ہم نظامِ سرمایہ داری کو اس کی اصل بنیادوں پر قائم رکھتے ہوئے اس کے اندر اس طرح کی اصلاحات کرتے ہیں جیسی اب تک امریکہ اور انگلستان وغیرہ ممالک میں ہوتی ہیں تو ان سے جمہوریّت اور انفرادی آزادی تو برقرار رہتی ہے مگر ان بڑی اور اصل خرابیوں میں سے کوئی ایک بھی دُور نہیں ہوتی جن کی بدولت نظامِ سرمایہ داری دنیا کے لیے ایک لعنت اور مصیبت بن چکا ہے۔

گویا ایک طرف کنوآں ہے تو دوسری طرف کھائی۔ اجتماعی فلاح کا انتظام کیا جاتا ہے تو افراد کی آزادی ختم ہوجاتی ہے۔ افراد کی آزادی کو بچایا جاتا ہے تو اجتماعی فلاح غارت ہوجاتی ہے۔ ایسا کوئی نظامِ زندگی دنیا نہیں پا سکی

ہے جس میں صنعتی انقلاب تو اپنی تمام برکات کے ساتھ جوں کا توں چلتا اور بڑھتا رہے اور پھر انفرادی آزادی اور اجتماعی فلاح دونوں بہ یک وقت پورے اعتدال کے ساتھ نبھ جائیں۔ اسی قسم کے ایک نظام کی دریافت پر دنیا کا مستقبل معلق ہے۔ اگر وہ نہ ملا تو صنعتی انقلاب ہی کے پستول سے انسان خودکشی کرلیگا۔ اور اگر وہ مل گیا تو جو ملک بھی اس کا ایک کامیاب نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دے گا وہی دنیا کا امام بن جائے گا۔

اسلامی نظمِ معیشت کے بنیادی ارکان

اسلام نے اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان جو متوسط معاشی نظریہ اختیار کیا ہے اس پر ایک نظام کی عمارت اٹھانے کے لیے وہ سب سے پہلے فرد اور معاشرے میں چند ایسی اخلاقی اور عملی بنیادیں قائم کرتا ہے جو اس عمارت کو مضبوطی کے ساتھ سنبھال سکیں۔ اس غرض کے لیے وہ ہر ہر فرد کی ذہنیت کو درست کر کے اس میں ٹھیک وہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس متوازن نظام کے چلانے والے افراد میں درکار ہے۔ وہ انفرادی آزادی پر چند حدود عائد کرتا ہے تاکہ وہ اجتماعی مفاد کے لیے مضر ہونے کے بجائے مثبت طور پر مفید و معاون ہو جائے۔ وہ معاشرے میں کچھ ایسے قواعد مقرر کرتا ہے جو معاشی زندگی کو خراب کرنے والے اسباب کا سدباب کر دیتے ہیں یہ اسلامی نظمِ معیشت کے بنیادی ارکان ہیں جنہیں سمجھ لینا جدید معاشی پیچیدگیوں کے اسلامی حل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

۱۔ اکتسابِ مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو دولت کمانے کا عام

لائسنس نہیں دیتا بلکہ کمائی کے طریقوں میں اجتماعی مفاد کے لحاظ سے جائز اور ناجائز کا امتیاز قائم کرتا ہے یہ امتیاز اس قاعدۂ کلیہ پر مبنی ہے کہ دولت حاصل کرنے کے تمام وہ طریقے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے شخص یا اشخاص کے نقصان پر ہو، اور ہر وہ طریقہ جائز ہے جس میں فوائد کا مبادلہ اشخاص متعلقہ کے درمیان منصفانہ طور پر ہو۔ قرآن مجید میں اس قاعدۂ کلیہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا۔ (النسا۔۲۹-۳۰)

"اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو بجز اس کے کہ لین دین آپس کی رضامندی سے ہو۔ اور تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے حال پر مہربان ہے۔ اور جو کوئی اپنی حد سے تجاوز کر کے ظلم کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم آگ میں جھونک دیں گے۔"

اس آیت میں لین دین کے لیے جواز کی دو شرطیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ لین دین باہمی رضامندی سے ہو۔ دوسرے یہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ اس معنی میں وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ کا فقرہ نہایت بلیغ ہے۔ اس کے دو مفہوم ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد لیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ تم آپس میں ایک

دوسرے کو ہلاک نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے فائدے کے لیے دوسرے کا نقصان کرتا ہے وہ گویا اس کا خون پیتا ہے، اور مآل کار میں خود اپنی تباہی کا بھی راستہ کھولتا ہے۔ چوری، رشوت، قمار، دغا و فریب، سود اور تمام ان تجارتی طریقوں میں جن کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے، عدم جواز کے یہ دونوں اسباب پائے جاتے ہیں، اور اگر بعض میں باہمی رضامندی کے وہم کی گنجائش بھی ہے تو لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کی دوسری اہم شرط مفقود ہے۔

۲۔ مال جمع کرنے کی ممانعت

دوسرا اہم حکم یہ ہے کہ جائز طریقوں سے جو دولت کمائی جائے اس کو جمع نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے دولت کی گردش رک جاتی ہے اور تقسیم دولت میں توازن برقرار نہیں رہتا۔ دولت سمیٹ کر جمع کرنے والا نہ صرف خود بدترین اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ درحقیقت وہ پوری جماعت کے خلاف ایک شدید جرم کا ارتکاب کرتا ہے، اور اس کا نتیجہ آخر کار خود اس کے اپنے لیے بھی برا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید بخل اور قارونیت کا سخت مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ۔ (آل عمران: ۱۸۰)

"جو لوگ اللہ کے دیئے ہوئے فضل میں بخل کرتے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ فعل ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ درحقیقت یہ ان کے لیے

بُرا ہے"۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (التوبہ۔ ۳۴)

"اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ اُن کو عذاب الیم کی خبر دے دو"۔

یہ چیز سرمایہ داری کی بنیاد پر ضرب لگاتی ہے۔ بچت کو جمع کرنا اور جمع شدہ دولت کو مزید دولت پیدا کرنے میں لگانا ہی دراصل سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ مگر اسلام سرے سے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی اپنی ضرورت سے زائد دولت کو جمع کر کے رکھے۔

۴۔ خرچ کرنے کا حکم

جمع کرنے کی بجائے اسلام خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر خرچ کرنے سے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے عیش و آرام اور گلچھرے اڑانے میں دولت لٹائیں۔ بلکہ وہ خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ دیتا ہے۔ یعنی آپ کے پاس اپنی ضرورت سے جو کچھ بچ جاتے اس کو جماعت کی بھلائی کے کاموں میں خرچ کر دیں کہ یہی سبیل اللہ ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ۔ ۲۱۹)

"اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہو کہ جو ضرورت سے بچ رہے"۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النساء-۳۶)

"اور نیک سلوک کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور نادار مسکینوں اور قرابت دار پڑوسیوں اور اجنبی ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے والے دوستوں اور مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ۔"

وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات-۱۹)

"اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے۔"

یہاں پہنچ کر اسلام کا نقطۂ نظر سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ خرچ کرنے سے مفلس ہو جاؤں گا اور جمع کرنے سے مالدار رہوں گا۔ اسلام کہتا ہے خرچ کرنے سے برکت ہوگی۔ تیری دولت گھٹے گی نہیں بلکہ اور بڑھے گی۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ (البقرہ-۲۶۸)

"شیطان تم کو ناداری کا خوف دلاتا ہے اور بخل جیسی شرمناک بات کا حکم دیتا ہے، مگر اللہ تم سے بخشش اور مزید عطا کا وعدہ کرتا ہے۔"

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ جو کچھ خرچ کر دیا وہ کھو یا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں کھویا نہیں گیا بلکہ اس کا بہتر فائدہ تمہاری طرف پھر پلٹ کر آئے گا۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔

(البقرہ۔۲۷۲)

"اور تم نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کروگے وہ تم کو پورا پورا ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔"

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔

(فاطر۔ ۲۹-۳۰)

"اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ ان کے بدلے ان کو پورے پورے اجر دیگا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ ہی عنایت کرے گا۔"

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ دولت کو جمع کرکے اس کو سود پر پھیلانے سے دولت بڑھتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں، سود سے تو دولت گھٹ جاتی ہے دولت بڑھانے کا ذریعہ نیک کاموں میں اسے خرچ کرنا ہے۔

یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ (البقرہ۔ ۲۷۶)

"اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔"

وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم۔ ۳۹)

"اور یہ جو تم سُود دیتے ہو تا کہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک وہ ہرگز نہیں بڑھتا، بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کے لیے زکوٰۃ میں دیتے ہو۔"

یہ ایک نیا نظریہ ہے جو سرمایہ داری کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ خرچ کرنے سے دولت کا بڑھنا اور خرچ کیے ہوئے مال کا ضائع نہ ہونا بلکہ اس کا پورا پورا بدل کچھ زائد فائدے کے ساتھ واپس آنا، سُود سے دولت میں اضافہ ہونے کے بجائے اُلٹا گھاٹا آنا، زکوٰۃ و صدقات سے دولت میں کمی واقع ہونے کے بجائے اضافہ ہونا، یہ ایسے نظریات ہیں جو بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ سننے والا سمجھتا ہے کہ شاید ان سب باتوں کا تعلق محض ثوابِ آخرت سے ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان باتوں کا تعلق ثوابِ آخرت سے بھی ہے، اور اسلام کی نگاہ میں اصلی اہمیت اسی کی ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں بھی معاشی حیثیت سے یہ نظریات ایک نہایت مضبوط بنیاد پر قائم ہیں۔ دولت کو جمع کرنے اور اس کو سُود پر چلانے کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ دولت سمٹ سمٹ کر چند افراد کے پاس اکٹھی ہو جائے۔ جمہور کی قوتِ خرید (Purchasing Power) روز بروز گھٹتی چلی جائے۔ صنعت اور تجارت اور زراعت میں کساد بازاری رونما ہو، قوم کی معاشی زندگی تباہی کے سرے پر جا پہنچے، اور آخر کار خود سرمایہ دار افراد کے لیے بھی اپنی جمع شدہ دولت کو افزائشِ دولت کے کاموں میں لگانے کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔

لے اس بات کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

بخلاف اس کے خرچ کرنے اور زکوٰۃ وصدقات دینے کا مآل یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد تک دولت پھیل جائے، ہر ہر شخص کو کافی قوتِ خرید حاصل ہو، صنعتیں پرورش پائیں، کھیتیاں سرسبز ہوں، تجارت کو خوب فروغ ہو، اور چاہے کوئی لکھ پتی اور کروڑ پتی نہ ہو، مگر سب خوشحال وفارغ البال ہوں۔ اس آل اندیشانہ معاشی نظریہ کی صداقت اگر دیکھنی ہو تو سرمایہ داری نظام کے تحت دنیا کے موجودہ معاشی حالات کو دیکھیے کہ جہاں سُود ہی کی وجہ سے تقسیم ثروت کا توازن بگڑ گیا ہے، اور صنعت وتجارت کی کساد بازاری نے عوام کی معاشی زندگی کو تباہی کے سرے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ابتدائے عہد اسلامی کی حالت کو دیکھیے کہ جب اس معاشی نظریہ کو پُوری شان کے ساتھ عملی جامہ پہنایا گیا تو چند سال کے اندر عوام کی خوشحالی اس مرتبہ کو پہنچ گئی کہ لوگ زکوٰۃ کے مستحقین کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خود صاحب نصاب نہ ہو۔ ان دونوں حالتوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کس طرح سُود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

پھر اسلام جو ذہنیت پیدا کرتا ہے وہ بھی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ دار کے ذہن میں کسی طرح یہ تصوّر سما ہی نہیں سکتا کہ ایک شخص اپنا روپیہ دوسرے کو سُود کے بغیر کیسے دے سکتا ہے۔ وہ قرض پر نہ

۴- ان الربا وان کثیر فان عاقبتہٗ تصیر الیٰ قلّ (ابن ماجہ، بیہقی، احمد) یعنی "سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو مگر انجام کار وہ کمی کی طرف پلٹتا ہے۔"

صرف سُود لیتا ہے بلکہ اپنے راس المال اور سُود کی بازیافت کے لیے قرضدار کے کپڑے اور گھر کے برتن تک قرق کرا لیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حاجتمند کو صرف قرض ہی نہ دو بلکہ اگر وہ تنگ دست ہو تو اس پر تقاضے میں سختی بھی نہ کرو، حتیٰ کہ اگر اس میں دینے کی استطاعت نہ ہو تو معاف کر دو۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (البقرہ ۔ ۲۸۰)

"اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کی حالت درست ہونے تک اسے مہلت دے دو، اور اگر معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اس کا فائدہ تم سمجھ سکتے ہو اگر کچھ علم رکھتے ہو۔"

سرمایہ داری میں امداد باہمی کے معنی یہ ہیں کہ آپ انجمن امداد باہمی کو پہلے روپیہ دے کر اس کے رکن بنیے، پھر اگر کوئی ضرورت آپ کو پیش آئے گی تو انجمن آپ کو عام بازاری شرح سُود سے کچھ کم پر قرض دے دیگی۔ اگر آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے تو "امداد باہمی" سے آپ کچھ بھی امداد حاصل نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے اسلام کے ذہن میں امداد باہمی کا تصور یہ ہے کہ جو لوگ ذی استطاعت ہوں وہ ضرورت کے وقت اپنے کم استطاعت بھائیوں کو نہ صرف قرض دیں بلکہ قرض ادا کرنے میں بھی حسبتہً للہ ان کی مدد کریں، چنانچہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف والغارمین بھی ہے یعنی قرضداروں کے قرض ادا کرنا۔

سرمایہ دار اگر نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے تو محض نمائش کے لیے، کیونکہ اس کم نظر کے نزدیک اس خرچ کا کم سے کم یہ معاوضہ تو اس کو حاصل ہونا ہی

چاہیے کہ اس کا نام ہو جائے۔ اس کو مقبولیت عام حاصل ہو، اس کی دھاک اور ساکھ بیٹھ جائے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ خرچ کرنے میں نمائش ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ خفیہ یا علانیہ جو کچھ بھی خرچ کرو، اس میں یہ مقصد پیش نظر ہی نہ رکھو کہ فوراً اس کا بدل تم کو کسی نہ کسی شکل میں مل جائے بلکہ مآل کار پر نگاہ رکھو۔ اس دنیا سے لے کر آخرت تک جتنی دور تمہاری نظر جائے گی تم کو یہ خرچ پھلتا پھولتا اور منافع پر منافع پیدا کرتا ہی دکھائی دے گا۔ "جو شخص اپنے مال کو نمائش کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر مٹی پڑی تھی۔ اس نے اس مٹی پر بیج بویا، مگر پانی کا ایک ریلہ آیا اور مٹی کو بہالے گیا۔ اور جو شخص اپنی نیت کو درست رکھ کر اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے اُس نے ایک عمدہ زمین میں باغ لگایا، اگر بارش ہو گئی تو دوگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ ہوئی تو محض ہلکی سی پھوار اس کے لیے کافی ہے۔"

(سورۂ بقرہ - ۲۶۴ - ۲۶۵)

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۤءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

(البقرہ - ۲۷۱)

"اگر صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر دو اور غریب لوگوں تک پہنچاؤ تو یہ زیادہ بہتر ہے۔"

سرمایہ دار اگر نیک کام میں کچھ صرف بھی کرتا ہے تو یا دلِ ناخواستہ۔ بدتر

سے بدتر مال دیتا ہے اور پھر جس کو دیتا ہے اس کی آدھی جان اپنی زبان کے نشتروں سے نکال لیتا ہے۔ اسلام اس کے بالکل برعکس یہ سکھاتا ہے کہ اچھا مال خرچ کرو، اور خرچ کر کے احسان نہ جتاؤ، بلکہ اس کی خواہش بھی نہ رکھو کہ کوئی تمہارے سامنے احسان مندی کا اظہار کرے۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔

(البقرہ۔ ۲۶۷)

"تم نے جو کچھ کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے عمدہ اموال کو راہ خدا میں صرف کرو نہ یہ کہ بدتر مال چھانٹ کر اس میں سے دینے لگو۔"

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (البقرہ۔ ۲۶۴)

"اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر ملیا میٹ نہ کر دو۔"

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا۔ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا۔ (الدھر۔ ۸-۹)

"اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے لیے تم کو کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کسی جزا اور شکریہ کے خواہش مند نہیں ہیں۔"

چھوڑیئے اس سوال کو کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان دونوں ذہنیتوں میں کتنا عظیم تفاوت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خالص معاشی نقطۂ نظر ہی سے دیکھ لیجیے کہ فائدے اور نقصان کے ان دونوں نظریوں میں سے کونسا نظریہ زیادہ محکم اور دُور رس نتائج کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ پھر جب کہ منفعت و مضرت کے باب میں اسلام کا نظریہ وہ ہے جو آپ دیکھ چکے ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ اسلام کسی شکل میں بھی سُودی کاروبار کو جائز رکھے؟

۴۔ زکوٰۃ

اسلام کا مقصد، جیسا کہ اوپر بیان ہُوا، یہ ہے کہ دولت کسی جگہ جمع نہ ہونے پائے۔ وہ چاہتا ہے کہ جماعت کے جن افراد کو اپنی بہتر قابلیت یا خوش قسمتی کی بنا پر ان کی ضرورت سے زیادہ دولت میسّر آ گئی ہو وہ اس کو سمیٹ کر نہ رکھیں بلکہ خرچ کریں، اور ایسے مصارف میں خرچ کریں جن سے دولت کی گردش میں سوسائٹی کے کم نصیب افراد کو بھی کافی حصّہ مل جائے۔ اس غرض کے لیے اسلام ایک طرف اپنی بلند اخلاقی تعلیم اور ترغیب و ترہیب کے نہایت مؤثر طریقوں سے فیاضی اور حقیقی امدادِ باہمی کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے، تاکہ لوگ خود اپنے میلانِ طبع ہی سے دولت جمع کرنے کو بُرا سمجھیں اور اسے خرچ کر دینے کی طرف راغب ہوں۔ دوسری طرف وہ ایسا قانون بناتا ہے کہ جو لوگ فیاضی کی اس تعلیم کے باوجود اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے روپیہ جوڑنے اور مال سمیٹنے کے خوگر ہوں، یا جن کے پاس کسی نہ کسی طور پر مال جمع ہو جائے، ان کے مال میں سے بھی کم از کم ایک حصّہ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ضرور نکلوا لیا جائے۔

اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے۔ اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اس کو ارکانِ اسلام میں شامل کر دیا گیا ہے۔ نماز کے بعد سب سے زیادہ اسی کی تاکید کی گئی ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص دولت جمع کرتا ہے، اس کی دولت اس کے لیے حلال ہی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ زکوٰۃ نہ ادا کرے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (التوبہ۔۱۰۳)

"ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرو اور اس کے ذریعہ سے ان کو پاک اور طاہر کر دو۔"

لفظ زکوٰۃ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مالدار آدمی کے پاس جو دولت جمع ہوتی ہے وہ اسلام کی نگاہ میں ایک نجاست ہے، ایک ناپاکی ہے اور وہ پاک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا مالک اس میں سے ہر سال کم از کم ڈھائی فی صدی راہِ خدا میں خرچ نہ کر دے۔ "راہِ خدا" کیا ہے؟ خدا کی ذات تو بے نیاز ہے، اس کو نہ تمہارا مال پہنچتا ہے نہ وہ اس کا حاجت مند ہے۔ اس کی راہ بس یہی ہے کہ تم خود اپنی قوم کے تنگ حال لوگوں کو خوش حال بنانے کی کوشش کرو اور ایسے مفید کاموں کو ترقی دو جن کا فائدہ ساری قوم کو حاصل ہوتا ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (التوبہ۔۶۰)

"صدقات تو دراصل فقراء اور مساکین کے لیے ہیں اور ان کارکنوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل پر مقرر ہوں اور ان لوگوں کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ اور لوگوں کی گردنیں بند اسیری سے چھڑانے کے لیے اور قرضداروں کے لیے اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے لیے اور مسافروں کے لیے۔"

یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ یہ اِن کی انشورنس کمپنی ہے۔ یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے۔ یہ ان کے لیے بے کاروں کا سرمایۂ اعانت ہے۔ یہ ان کے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعۂ پرورش ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکرِ فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادا اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی مدد کرو۔ کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا بنے گا؟ مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہو گا؟ کوئی آفت ناگہانی آ پڑی، بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آ گیا، دیوالہ نکل گیا، تو ان مصیبتوں سے خلاصی کی کیا سبیل ہو گی؟ سفر میں پیسہ پاس نہ رہا تو کیونکر گزر بسر ہو گی؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لیے بے فکر کر دیتی ہے۔ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے ڈھائی فی صدی دے کر اللہ کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرا لو۔ اس وقت تم کو اس دولت کی ضرورت نہیں ہے، یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں۔ کل جب تم ضرورت مند ہو گے یا تمہاری اولاد ضرورت مند

ہو گی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے بھی زیادہ تم کو واپس مل جائے گا۔

یہاں پھر سرمایہ داری اور اسلام کے اصول و مناہج میں کلی تضاد نظر آتا ہے سرمایہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ روپیہ جمع کیا جائے اور اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جائے تاکہ ان نالیوں کے ذریعہ سے آس پاس کے لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس جھیل میں جمع ہو جائے۔ اسلام اس کے بالکل خلاف یہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ اوّل تو جمع ہی نہ ہو، اور اگر جمع ہو بھی تو اس تالاب میں سے زکوٰۃ کی نہریں نکال دی جائیں تاکہ جو کھیت سوکھے ہیں ان کو پانی پہنچے اور گرد و پیش کی ساری زمین شاداب ہو جائے۔ سرمایہ داری کے نظام میں دولت کا مبادلہ مقید ہے، اور اسلام میں آزاد۔ سرمایہ داری کے تالاب سے پانی لینے کے لیے ناگزیر ہے کہ خاص آپ کا پانی پہلے سے وہاں موجود ہو، ورنہ آپ ایک قطرۂ آب بھی وہاں سے نہیں لے سکتے ——— اس کے مقابلہ میں اسلام کے خزانۂ آب کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو وہ اس میں لا کر ڈال دے اور جس کو پانی کی ضرورت ہو وہ اس میں سے لے لے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طریقے اپنی اصل اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی پوری پوری ضد ہیں، اور ایک ہی نظم معیشت میں دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

۵۔ قانونِ وراثت

اپنی ضرورت پر خرچ کرنے اور راہِ خدا میں دینے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی جو دولت کسی ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو، اس کو پھیلانے کے لیے پھر ایک

تدبیر اسلام نے اختیار کی ہے اور وہ اس کا قانونِ وراثت ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جو شخص مال چھوڑ کر مر جائے، خواہ وہ زیادہ ہو یا کم، اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نزدیک و دور کے تمام رشتہ داروں میں درجہ بدرجہ پھیلا دیا جائے اور اگر کسی کا کوئی وارث بھی نہ ہو یا نہ ملے تو بجائے اس کے کہ اسے متبنیٰ بنانے کا حق دیا جائے، اس کے مال کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دینا چاہیئے تاکہ اس سے پوری قوم فائدہ اٹھائے۔ تقسیم وراثت کا یہ قانون جیسا اسلام میں پایا جاتا ہے، کسی اور معاشی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے معاشی نظاموں کا میلان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے سمیٹ کر جمع کی ہے وہ اس کے بعد بھی ایک یا چند اشخاص کے پاس سمٹی رہے۔[1] مگر اسلام دولت کے سمٹنے کو پسند ہی نہیں کرتا۔ وہ اس کو پھیلانا چاہتا ہے تاکہ دولت کی گردش میں آسانی ہو۔

۶۔ غنائمِ جنگ اور اموالِ مفتوحہ کی تقسیم

اس معاملہ میں بھی اسلام نے وہی مقصد پیشِ نظر رکھا ہے۔ جنگ میں جو مالِ غنیمت فوجوں کے ہاتھ آئے اس کے متعلق یہ قانون بنایا گیا ہے کہ اس کے پانچ حصے کیے جائیں، چار حصے فوج میں تقسیم کر دیئے جائیں، اور ایک حصہ اس غرض کے لیے رکھ لیا جائے کہ عام قومی مصالح میں صرف ہو۔

---

[1] اولادِ اکبر کی جانشینی کا قانون (Law of Primogeniture) اور مشترک خاندان کا طریقہ (Joint Family System) اسی مقصد پر مبنی ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔ (الانفال-۴۱)

"جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت میں ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور اس کے رسُول اور رسول کے رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔"

اللہ اور رسول کے حصّہ سے مراد ان اجتماعی اغراض و مصالح کا حصّہ ہے جن کی نگرانی اللہ اور رسول کے تحت حکم اسلامی حکومت کے سپرد کی گئی ہے۔

رسول کے رشتہ داروں کا حصّہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ زکوٰۃ میں ان کا حصّہ نہیں ہے۔

اس کے بعد خمس میں تین طبقوں کا حصّہ خصوصیت کے ساتھ رکھا گیا ہے:

قوم کے یتیم بچے تاکہ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو اور ان کو زندگی کی جدوجہد میں حصّہ لینے کے قابل بنایا جائے۔

مساکین جن میں بیوہ عورتیں، اپاہج، معذور، بیمار اور نادار سب شامل ہیں۔

ابن السبیل یعنی مسافر۔ اسلام نے اپنی اخلاقی تعلیم سے لوگوں میں مسافر نوازی کا میلان خاص طور پر پیدا کیا ہے اور اس کے ساتھ زکوٰۃ و صدقات

اور غنائم جنگ میں بھی مسافروں کا حق رکھا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے اسلامی ممالک میں تجارت، سیاحت، تعلیم اور مطالعہ و مشاہدہ آثار و احوال کے لیے لوگوں کی نقل و حرکت میں بڑی آسانیاں پیدا کردیں۔

جنگ کے نتیجہ میں جو اراضی اور اموال اسلامی حکومت کے ہاتھ آئیں ان کے لیے یہ قانون بنایا گیا کہ ان کو بالکلیہ حکومت کے قبضہ میں رکھا جائے۔

مَا اَفَاءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔۔۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُھٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ۔۔۔ وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔۔۔۔۔

وَالَّذِیْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِھِمْ (الحشر: ۷-۱۰)

"جو کچھ مال و جائداد اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں کے باشندوں سے فے میں دلوایا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول اور رسول کے رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ یہ مال صرف تمہارے دولت مندوں ہی کے درمیان چکر نہ لگاتا رہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس میں ان نادار مہاجرین کا بھی حصہ ہے جو اپنے گھر بار اور جائدادوں سے بے دخل کرکے نکال دیئے گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ میں ایمان لے آتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ اور ان آئندہ نسلوں

بکا بھی حصّہ ہے جو بعد میں آنے والی ہیں۔"

اس آیت میں نہ صرف ان مصارف کی توضیح کی گئی ہے جن میں اموالِ فئے کو صرف کیا جائے گا، بلکہ صاف طور پر اس مقصد کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جس کو اسلام نے نہ صرف اموالِ فئے کی تقسیم میں، بلکہ اپنے پورے معاشی نظام میں پیش رکھا ہے یعنی کی لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ (مال تمہارے مالداروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے) یہ مضمون جس کو قرآن مجید نے ایک چھوٹے سے جامع فقرے میں بیان کر دیا ہے، اسلامی معاشیات کا سنگِ بنیاد ہے

۷۔ اقتصاد کا حکم

ایک طرف اسلام نے دولت کو تمام افرادِ قوم میں گردش دینے اور مالداروں کے مال میں ناداروں کو حصّہ دار بنانے کا انتظام کیا ہے، جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر شخص کو اپنے خرچ میں اقتصاد اور کفایت شعاری ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے تاکہ افراد اپنے معاشی وسائل سے کام لینے میں افراط یا تفریط کی روش اختیار کر کے تقسیمِ ثروت کے توازن کو نہ بگاڑ دیں۔ قرآن مجید کی جامع تعلیم اس باب میں یہ ہے کہ:-

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔ (بنی اسرائیل۔۲۹)

"نہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھ (کہ کھلے ہی نہیں)
اور نہ اس کو بالکل ہی کھول دے کہ بعد میں حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہے۔"

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ

يَكُنْ ذَالِكَ قَوَامًا (الفرقان - ۶۷)

"اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل برتتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل رہتے ہیں۔"

اس تعلیم کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص جو کچھ خرچ کرے اپنے معاشی وسائل کی حد میں رہ کر خرچ کرے۔ نہ اس قدر حد سے تجاوز کر جائے کہ اس کا خرچ اس کی آمدنی سے بڑھ جائے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فضول خرچیوں کے لیے ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھرے۔ دوسروں کی کمائی پر ڈاکے مارے، حقیقی ضرورت کے بغیر لوگوں سے قرض لے اور پھر یا تو ان کے قرض مار کھائے یا قرضوں کا بھگتان بھگتنے میں اپنے تمام معاشی وسائل کو صرف کر کے اپنے آپ کو خود اپنے کیے کرتوتوں سے فقراء و مساکین کے زمرہ میں شامل کر دے۔ نہ ایسا بخیل بن جائے کہ اس کے معاشی وسائل جس قدر خرچ کرنے کی اس کو اجازت دیتے ہوں، اتنا بھی نہ خرچ کر دے۔ پھر اپنی حد کے اندر رہ کر خرچ کرنے کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر وہ اچھی آمدنی رکھتا ہے تو اپنی ساری کمائی صرف اپنے عیش و آرام اور تزک و احتشام پر صرف کر دے، درآں حالیکہ اس کے عزیز، قریب دوست، ہمسائے مصیبت کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس قسم کے خود غرضانہ خرچ کو بھی اسلام فضول خرچی ہی شمار کرتا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ

كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۔ (بنی اسرائیل ۔ ۲۶ - ۲۷)

"اور اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو۔ فضول خرچی نہ کر۔ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔"

اسلام نے اس باب میں صرف اخلاقی تعلیم ہی دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس نے بخل اور فضول خرچی کی انتہائی صورتوں کو روکنے کے لیے قوانین بھی بنائے ہیں، اور ایسے تمام طریقوں کا سدِ باب کرنے کی کوشش کی ہے جو تقسیم ثروت کے توازن کو بگاڑنے والے ہیں۔ وہ جوئے کو حرام قرار دیتا ہے۔ شراب اور زنا سے روکتا ہے۔ لہو و لعب کی بہت سی مسرفانہ عادتوں کو جن کا لازمی نتیجہ ضیاعِ وقت اور ضیاعِ مال ہے، ممنوع قرار دیتا ہے۔ موسیقی کے فطری ذوق کو اس حد تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے، جہاں انسان کا انہماک دوسری اخلاقی و روحانی خرابیاں پیدا کرنے کے ساتھ معاشی زندگی میں بھی بدنظمی پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے اور فی الواقع ہو جاتا ہے۔ جمالیات کے طبعی رجحان کو بھی وہ حدود کا پابند بناتا ہے۔ قیمتی ملبوسات، زر و جواہر کے زیورات، سونے چاندی کے ظروف اور تصاویر اور مجسموں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام مروی ہیں ان سب میں دوسرے مصالح کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی پیش نظر ہے کہ جو دولت تمہارے بہت سے غریب بھائیوں کی ناگزیر ضرورتیں پوری کر سکتی ہے، ان کو زندگی کے مایحتاج فراہم کر کے دے سکتی ہے، اسے محض اپنے جسم اور اپنے گھر کی تزئین اور آرائش پر صرف کر دینا جمالیت نہیں،

شقاوت اور بدترین خود غرضی ہے۔ غرض اخلاقی تعلیم اور قانونی احکام دونوں طریقوں سے اسلام نے انسان کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہے وہ ایسی سادہ زندگی ہے کہ اس میں انسان کی ضروریات اور خواہشات کا دائرہ اتنا وسیع ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک اوسط درجہ کی آمدنی میں گزر بسر نہ کر سکتا ہو، اور اسے اپنے دائرہ سے پاؤں نکال کر دوسروں کی کمائیوں میں حصّہ لڑانے کی ضرورت پیش آئے۔ یا اگر وہ اوسط سے زیادہ آمدنی رکھتا ہو تو اپنا تمام مال خود اپنی ذات پر خرچ کر دے اور اپنے ان بھائیوں کی مدد نہ کر سکے جو اوسط سے کم آمدنی رکھتے ہوں۔

جدید معاشی پیچیدگیوں کا

اسلامی حل

آیئے اب ہم دیکھیں کہ اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں کی بنیاد پر وہ پیچیدگی کس طرح حل ہو سکتی ہے جسے ہم نے "تاریخ کا سبق" پیش کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے چند بنیادی حقیقتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

چند بنیادی حقیقتیں

اولین بات جس کو جان لینا اسلامی نظامِ تمدن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے، یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا قوم یا معاشرے کی۔ فرد جماعت کے لیے نہیں ہے بلکہ جماعت فرد کے لیے ہے۔ خدا کے سامنے جماعت یا قوم یا معاشرہ اپنی مجموعی حیثیت میں جواب دہ نہیں ہے بلکہ ایک ایک شخص فرداً فرداً اپنی ذاتی حیثیت میں ذمہ دار و جواب دہ ہے۔ اور اس ذاتی ذمہ داری و جواب دہی پر ہی انسان کی ساری اخلاقی قدر و قیمت

کا مدار ہے۔ اجتماعی زندگی سے اصل مقصود مجموعی خوشحالی نہیں بلکہ ایک ایک فرد انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ ایک نظامِ اجتماعی کے صالح یا فاسد ہونے کا حقیقی معیار یہ ہے کہ وہ اپنے افراد کی شخصیتوں کے پھلنے پھولنے میں اور ان کی ذاتی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے میں کس حد تک معاون و مددگار یا مانع و مزاحم ہوتا ہے۔ اس بنا پر اسلام اجتماعی تنظیم کی کسی ایسی صورت کو، اور حیاتی فلاح کے نام سے کسی ایسی اسکیم یا تدبیر کو پسند نہیں کرتا جس سے افراد جماعتی شکنجے میں اس طرح کس جاتے ہوں کہ ان کی مستقل شخصیت ہی دب جائے اور بہت سے آدمی چند آدمیوں کے ہاتھوں میں بے رُوح اوزار بن کر رہ جائیں۔

انسان کی انفرادیت کا صحیح نشوونما اور اس کی شخصیت کا پُورا اُبھار اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اسے فکر و عمل کی آزادی حاصل ہو۔ اس غرض کے لیے صرف آزادیٔ رائے، آزادیٔ تحریر و تقریر، آزادیٔ سعی و عمل، اور آزادیٔ اجتماع ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ آزادیٔ معاش بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے جسے ثابت کرنے کے لیے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔ صرف عقلِ عام ہی اس کا ادراک کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک راہ چلتا آدمی بھی اس بات کو خوب جانتا ہے کہ جس شخص کی معاش آزاد نہیں ہے اسے درحقیقت کوئی آزادی بھی حاصل نہیں ہے، نہ رائے کی، نہ زبان اور قلم کی اور نہ سعی و عمل کی۔ لہٰذا انسانیت کے لیے اگر معاشرے کی کوئی حالت سب سے بہتر ہو سکتی ہے تو صرف وہ جس میں ایک بندۂ خدا کے لیے اس امر کے کافی مواقع موجود ہوں کہ اپنے ضمیر کو فروخت کیے بغیر اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت

سے دو وقت کی روٹی پیدا کر سکے۔ اگرچہ صنعتی انقلاب کے دَور میں اس کے مواقع بہت کم رہ گئے ہیں۔ بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں نے اور بڑے پیمانہ کی کاشت نے منفرد دست کاروں اور کاریگروں کے لیے اور چھوٹے چھوٹے سوداگروں اور کاشت کاروں کے لیے زندگی کا میدان اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں اپنے آزاد پیشے کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتے۔ تاہم جس نظام میں ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت برقرار ہو اس میں باوسیلہ اشخاص کے لیے اس امر کا اچھا خاصا موقع باقی رہتا ہے کہ خود اپنے آزاد صنعتی یا تجارتی یا زراعتی ادارے قائم کریں اور بے وسیلہ کارکنوں کے لیے بھی کم از کم اتنی گنجائش تو ضرور ہی باقی رہ جاتی ہے کہ ایک شخص یا ادارے کی نوکری و مزدوری ان کے ضمیر پر بار ہو تو دوسرے دروازے پر جا کھڑے ہوں۔ مگر جہاں تمام یا بیشتر ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے، یا جہاں شخصی ملکیتوں کو باقی رکھا جائے، مگر نازی و فاشی طریقے پر سارے معاشی کاروبار کو ریاست کے مکمل تسلط میں ایک ہمہ گیر منصوبہ بندی کے تحت چلایا جائے، ایسی جگہ تو افراد کی معاشی آزادی کسی طرح باقی رہ ہی نہیں سکتی اور اس کے خاتمہ کے ساتھ ذہنی، معاشرتی اور سیاسی آزادی کا جنازہ آپ سے آپ نکل جاتا ہے۔ لہٰذا جو نظامِ زندگی انسان کی انفرادیت کو عزیز رکھتا ہو اور انسانی شخصیت کے اُبھار کو مقصدی اہمیت دیتا ہو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ اجتماعی فلاح کی ایسی تمام اسکیموں کو اصولی طور پر اور قطعی و حتمی طور پر رد کر دے جن میں یہ تجویز کیا گیا ہو کہ زمینوں اور کارخانوں اور تجارتوں کو قومی ملکیت

بنا لیا جائے، یا ان پر ریاست کا تازیانہ تسلط قائم کر کے ایک مرکزی منصوبہ بندی کے تحت ساری معیشت کی مشین لگمائی شروع کر دی جائے۔

یہی پوزیشن اس معاملہ میں اسلام نے اختیار کی ہے۔ وہ کمیونزم کا تو ایک اور وجہ سے بھی مخالف ہے، اور وہ یہ ہے کہ کمیونسٹ حضرات ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر قومی ملکیت بنانے کے لیے مار دھاڑ اور زبردستی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اگر اس سکیم کو نافذ کرنے کے لیے یہ غاصبانہ ظلم و ستم اور ظالمانہ سلب و نہب کا طریقہ نہ بھی اختیار کیا جائے، اور اس کے بجائے ارتقائی سوشلزم کے وہ طریقے استعمال کیے جائیں جن سے زمینوں اور صنعتوں اور تجارتوں کو قوانین کے ذریعہ سے بتدریج قومی ملکیت میں تبدیل کیا جاتا ہے، تب بھی اسلام کا مزاج اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کا نظام اپنی عین فطرت ہی کے لحاظ سے انسانیت کش واقع ہوا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس نازی اور فاشی طرز کی ضابطہ بندیاں اور منصوبہ بندیاں بھی اسلام کی طبیعت کے بالکل خلاف ہیں، اس لیے کہ ان کے اجتماعی فوائد خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن انسانی تشخص کے ظہور اور نشو و ارتقاء اور تکمیل میں وہ بہر حال مانع ہیں۔

اس معاملہ کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اسلام جو ذہنیت اور اخلاقی نقطۂ نظر انسان کے اندر پیدا کرتا ہے اس کا سنگِ بنیاد ہے خدا کا خوف، اور خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس۔ یہ دونوں اوصاف جس شخص یا گروہ میں موجود ہوں اس پر اگر اجتماعی معاملات کی سربراہی کا بار ڈال دیا جائے تو وہ

ایسا ایک نظام قائم کرنے اور چلانے کے لیے خود ہی تیار نہیں ہو سکتا جس میں اپنے ذاتی بوجھ کے ساتھ ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی انفرادی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی وہ ان کے سر سے اتار کر خود اپنے سر پر لا دے۔ یہی وہ بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں ایک قحط کے موقع پر فرمائی تھی۔ جب آپؐ سے عرض کیا گیا کہ قیمتیں بہت چڑھ رہی ہیں، آپ سرکاری طور پر اشیاء کے نرخ مقرر فرما دیجیے، تو آپؐ نے ایسا کرنے سے انکار فرما دیا اور عذر یہ بیان کیا کہ انی

أرید ان ألقی اللہ ولیس لاحد عندی مظلمۃ یطلبنی بھا ــــ

"میں اپنے خدا سے اس طرح ملنا چاہتا ہوں کہ میرے خلاف کوئی ایک شخص بھی ظلم کی شکایت کرنے والا نہ ہو"[1]

مزید برآں اسلام ہر معاملہ میں انسان کو فطری حالت سے قریب تر رکھنا چاہتا ہے اور زندگی کے کسی پہلو میں بھی مصنوعی پن کو پسند نہیں کرتا۔ انسانی معیشت

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے گرانی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ دراصل جس سبب سے آپؐ نے انکار کیا تھا وہ یہ تھی کہ حکومت اپنی مصنوعی مداخلت سے قیمتوں کے پیچیدہ نظام کو درہم برہم کر دے۔ اس طریقہ کو چھوڑ کر آپ نے اپنی پوری قوت کاروباری لوگوں کی اخلاقی اصلاح پر صرف فرمائی اور مسلسل تبلیغ سے یہ بات ان کے ذہن نشین کی کہ بیان بوجھ کر قیمتیں چڑھانا ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ تبلیغ خوب کارگر ثابت ہوئی اور کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ قیمتیں اعتدال پر آنی شروع ہو گئیں۔

کے لیے فطری حالت یہی ہے کہ خدا نے رزق کے جو ذرائع اس زمین پر پیدا کیے ہیں ان کو افراد اپنے قبضے میں لائیں، فرد فرد اور گروہ گروہ بن کر ان پر تصرف اور ان سے استفادہ کریں اور اپنے آپس میں اشیاء اور خدمات کا آزادانہ لین دین کرتے رہیں۔ غیر معلوم مدّت سے اسی طرز پر انسانی معیشت کا کارخانہ چلتا آ رہا ہے اور یہ گنجائش کچھ اس فطری نظام ہی میں نکل سکتی ہے کہ ایک آدمی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے بھی اپنی معیشت میں آزاد اور اپنی زندگی میں مستقل ہو سکے۔ رہے وہ بے شمار چھوٹے بڑے "ازم" جو نیم پختہ ذہن کے لوگ آئے دن تصنیف کرتے رہتے ہیں، تو وہ سب ایک نہ ایک طرح کا مصنوعی نظام تجویز کرتے ہیں جس میں آدمی ایک مستقل ذی رُوح انسان ایک ذی شعور شخصیت اور ایک مقصدی اہمیت رکھنے والی ہستی کے بجائے محض اجتماعی مشین کا ایک پُرزہ بن کر رہ جاتا ہے

مصنوعی طریقوں کی طرح اسلام انقلابی طریقوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب کسبِ معاش کے بکثرت ایسے ذرائع استعمال کرتے تھے جن کو اسلام نے بعد میں آکر حرام اور سخت قابلِ نفرت ٹھیرایا۔ مگر پہلے کی جو املاک چلی آ رہی تھیں ان کے متعلق اسلام نے یہ جھگڑا نہیں اٹھایا کہ جن جن لوگوں نے حرام خوری کے ذریعہ سے دولت کمائی تھی اب ان کی املاک ضبط ہونی چاہییں۔ حتّٰی کہ سُود خواروں اور قحبہ گری کا پیشہ کرنے والوں اور ڈاکے مارنے والوں تک کے پچھلے اعمال پر گرفت نہ کی گئی۔ جس کے قبضے میں جو کچھ تھا، اسلام کے دیوانی قانون نے اس پر اس کے حقوقِ ملکیت تسلیم کر لیے، آئندہ کے

لیے حرام طریقوں کو بند کر دیا۔ اور سابقہ املاک کو اسلام کا قانونِ میراث بتدریج تحلیل کرتا چلا گیا۔

تشخیصِ مرض

مذکورۂ بالا حقائق کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا پیچھے پلٹ کر ایک نظر پھر ان مباحث پر ڈال لیجئے جو اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں گزر چکے ہیں۔ ان میں ہم نے یہ بتایا ہے کہ صنعتی انقلاب کے دور میں سرمایہ داری کا جدید نظام اگرچہ اٹھا تو تھا معیشت کے انہی اصولوں پر جن پر غیر معلوم زمانے سے انسانی معاش کا کاروبار چلتا چلا آرہا تھا، لیکن اس کے اندر خرابی پیدا ہونے کے چار بنیادی سبب پائے جاتے تھے جو آگے چل کر سخت ردِ عمل کے موجب ہوئے۔

اوّل یہ کہ اس نظام کے قائم کرنے والوں اور چلانے والوں نے ان اصولوں کے معاملہ میں وہ مبالغہ برتا جو نئے صنعتی دور کے لیے کسی طرح موزون نہ تھا۔

دوم یہ کہ انھوں نے ان فطری اصولوں کے ساتھ کچھ غلط اصولوں کی آمیزش بھی کر دی۔

سوم یہ کہ انہوں نے بعض ایسے اصولوں کو نظر انداز کر دیا جو ایک فطری نظامِ معیشت کے لیے اتنے ہی اہم ہیں جتنے وہ سات اصول جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد دیکھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ہم نے تفصیل کے ساتھ انہی ابواب میں یہ بھی بتایا ہے کہ ایک طرف سوشلزم، کمیونزم، فاشزم اور نازی ازم نے اور دوسری طرف نظامِ سرمایہ داری کے موجودہ وارثوں نے اس نظام کی پیدا کردہ خرابیوں

اصلاح کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ اس وجہ سے ناکام ہوتی ہیں کہ ان میں سے کسی نے بھی مرض کے بنیادی اسباب کو سرے سے نہیں سمجھا۔ ایک گروہ نے معیشت کے ان فطری اصولوں ہی کو اصل سببِ مرض سمجھ لیا جو قدیم ترین زمانے سے معمول بہ چلے آرہے تھے اور ان کا ازالہ کرنے کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی کا بھی ازالہ کر ڈالا۔ دوسرے گروہ نے اپنی ساری توجہ صرف شکایات رفع کرنے پر صرف کر دی اور ان بیشتر اسباب کو جوں کا توں باقی رہنے دیا جو دراصل خرابی کے موجب تھے، اس لیے ان کے نظام میں انفرادی آزادی تو باقی رہی مگر اس طرح کہ وہ اجتماعی مفاد کے لیے قریب قریب اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنی نظامِ سرمایہ داری کے کسی تاریک سے تاریک دور میں تھی۔

اب جو شخص بھی اس تشخیص مرض پر غور کرے گا وہ بآسانی اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ انسانیت کو دراصل ایک ایسے حکیمانہ متوازن نظام کی ضرورت ہے جو:

اوّلاً، معیشت کے فطری اصولوں کو تو برقرار رکھے، کیونکہ وہ انفرادی آزادی کے لیے ضروری ہیں، مگر ان کے برتنے میں مبالغہ کرنے کے بجائے افراد کی آزادیٔ سعی و عمل پر ایسی پابندیاں لگائے جن سے وہ اجتماعی مفاد کی نہ صرف یہ کہ دشمن نہ رہے بلکہ عملاً خادم بن جائے،

ثانیاً، ان فطری اصولوں کے ساتھ غلط اصولوں کی ہر آمیزش کو نظامِ معیشت سے خارج کر دے۔

ثالثاً، ان اصولوں کے ساتھ فطری نظامِ معیشت کے دوسرے بنیادی

اصولوں کو بھی بروئے کار لائے، اور
رابعًا، افراد کو ان فطری اصولوں کے حقیقی تقاضوں سے ہٹنے نہ دے۔

اسلامی علاج

ٹھیک یہی طریق کار ہے جو اسلام نے اختیار کیا ہے۔ وہ "بے قید معیشت" کو "آزاد معیشت" میں تبدیل کر دیتا ہے، اور اس آزادی کو اسی طرح چند حدود کا پابند بناتا ہے جس طرح تمدن و معاشرت کے تمام دوسرے شعبوں میں انسانی آزادی کو محدود کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ایسے تمام دروازے بند کر دیتا ہے جن سے آزاد معیشت میں فاسد و مفسد نظام سرمایہ داری کی خصوصیات اور اثرات و نتائج پیدا ہونے کا امکان ہو۔ آیئے اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ دیکھیں کہ اسلام کے اصولوں پر معیشت کا کیا نقشہ بنتا ہے۔

۱۔ زمین کی ملکیت

اسلام تمام دوسری ملکیتوں کی طرح زمین پر انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم و ثابت ہونے کے لیے مقرر ہیں ان ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہو سکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز۔ اس کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ایک گز مربع سے لے کر ہزارہا ایکڑ تک خواہ کتنی ہی زمین ہو، اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملک میں آئی ہے تو بہر حال وہ اس کی جائز ملک ہے۔ اس کے لیے خود کاشت کرنے کی قید بھی نہیں ہے۔ جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جا سکتا ہے۔

اور تجارت میں شرکت کی جا سکتی ہے، اسی طرح زمین بھی کرائے پر دی جا سکتی ہے، اور اس میں بھی شرکت کے اصول پر زراعت ہو سکتی ہے۔ بلا کرایہ کوئی شخص کسی کو دے، یا بٹائی لیے بغیر کسی کو اپنی زمین میں کاشت کر لینے دے تو یہ صدقہ ہے، مگر کرایہ و لگان[1] یا بٹائی پر معاملہ طے کرنا ویسا ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری یا کسی دوسری چیز کو کرایہ پر دینا۔ رہیں "نظام جاگیرداری" کی وہ خرابیاں جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں، تو نہ وہ خالص زمینداری کی پیداوار ہیں اور نہ ان کا علاج یہ ہے کہ سرے سے زمین کی شخصی ملکیت ہی اڑا دی جائے، یا اس پر مصنوعی حد بندیاں عاید کی جائیں جو "زرعی اصلاحات" کے نام سے آج کل کے نیم حکیم تجویز کر رہے ہیں۔ بلکہ اسلامی اصول پر ان کا علاج یہ ہے:

(۱) زمین کی خرید و فروخت پر سے تمام پابندیاں اٹھا دی جائیں اور اس کا لین دین بالکل اسی طرح کھلے طور پر ہو جس طرح دنیا کی دوسری چیزوں کا ہوتا ہے۔

(۲) زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ طبقوں کی مستقل تفریق ہر شکل اور ہر حیثیت سے قطعی ختم کر دی جائے۔

(۳) وہ مخصوص امتیازی حقوق بھی از روئے قانون منسوخ کر دیئے

---

[1] زمین کے کرایے یا ٹھیکے کی جائز اور ناجائز صورتوں کا فرق ہم نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں واضح کیا ہے۔

جائیں جو ہماری زندگی میں مالکان زمین کو حاصل ہیں۔

(۴) مالک زمین اور کاشتکار کے درمیان حقوق و فرائض از روئے قانون مقرر کر دیئے جائیں اور ان مقرر حقوق کے ماسوا کسی دوسری قسم کے حقوق مالکان زمین کو اپنے مزارعین پر حاصل نہ ہوں۔

(۵) زمینداری کی واحد صورت صرف یہ باقی رہنے دی جائے کہ مالک زمین اور مزارع کے درمیان تجارت کے شریکوں جیسا تعلق ہو۔ اس سے گزر کر جو زمینداری آلۂ ظلم بن جائے، یا ریاست کے اندر ایک ریاست کی شکل اختیار کر جائے، یا جسے ناجائز طریقوں سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا جائے، وہ چونکہ جائز زمینداری کی تعریف سے خارج ہے اس لیے اسے شخصی ملکیت کا وہ تحفظ حاصل نہ ہو جو صرف جائز زمینداری کا حق ہے۔

(۶) میراث کے معاملہ میں تمام رسوم جاہلیت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ زمینداروں کی موجودہ املاک شرعی طریقے پر ان کے زندہ وارثوں کے درمیان تقسیم کر دی جائیں اور آئندہ کے لیے زرعی جائدادوں کے معاملہ میں اسلام کا قانونِ میراث ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے۔

(۷) زمین بے کار ڈال رکھنے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ مثلاً یہ کہ جو زمینیں حکومت نے کسی کو بلا معاوضہ دی ہوں وہ اگر تین سال سے زیادہ مدت تک بے کار ڈال رکھی جائیں گی تو عطیہ منسوخ ہو جائے گا۔ اور جو زرخرید زمینیں افتادہ چھوڑ رکھی جائیں گی ان پر ایک خاص مدت کے بعد ٹیکس لگا دیا

جائے گا۔

(۸) زمینداروں اور کاشت کاروں سے ان کی پیداوار کا ایک مخصوص حصہ ان مقاصد کے لیے الگ سے لیا جائے جن کا ذکر آگے زکوٰۃ کے زیرِ عنوان آرہا ہے۔

(۹) نئے سائنٹفک طریقوں سے اگر بڑے پیمانے کی کاشت کرنی ہو تو اس کے لیے امدادِ باہمی کے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں چھوٹے چھوٹے مالکانِ زمین اپنے مالکانہ حقوق قائم رکھتے ہوئے آپس کی رضامندی سے اپنی املاک کو ایک بڑے کھیت میں تبدیل کریں اور مل جل کر ایک انجمن کی طرح اس کے کاروبار چلائیں۔

کیا ان اصلاحات کے بعد زمینداری میں کوئی ایسی خرابی باقی رہ جاتی ہے جس کی معقولیت کے ساتھ نشاندہی کی جاسکتی ہو؟[1]

۲۔ دوسرے ذرائع پیداوار

اسلام اشیاءِ استعمال اور ذرائع پیداوار کے درمیان اس طرح کا کوئی فرق تسلیم نہیں کرتا کہ ایک پر شخصی ملکیت جائز ہو اور دوسرے پر نہ ہو۔ اس کے نزدیک یہ بات بالکل جائز ہے کہ ایک آدمی دوسرے لوگوں کے لیے ان کی ضروریاتِ زندگی میں سے کوئی چیز تیار یا فراہم کرے اور اسے ان کے ہاتھ

---

[1] زمین اور اس کے انتظام کے بارے میں اسلامی احکام کا ایک مجموعہ "مسئلۂ ملکیتِ زمین" کے نام سے ہم نے الگ مرتب کر دیا ہے جس سے اس اجمال کی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے۔

فروخت کرے۔ یہ کام وہ خود اپنے ہاتھ سے بھی کر سکتا ہے اور دُوسروں سے اُجرت پر بھی کرا سکتا ہے۔ ایسے سامان کی تیاری یا فراہمی میں وہ جس مواد خام کو، جن آلات کو اور جس کارگاہ کو استعمال کرے، ان سب کا وہ مالک ہو سکتا ہے۔ یہ سب کچھ جس طرح صنعتی انقلاب کے دَور سے پہلے جائز تھا اُسی طرح اس دَور میں بھی جائز ہے۔ مگر بے قید صنعت و تجارت نہ پہلے صحیح تھی اور نہ اب صحیح ہے۔ اسلامی اصول پر اسے حسبِ ذیل قواعد کا پابند بنانا ضروری تھا اور ہے :

(۱) کسی ایسی فنی ایجاد کو، جو انسانی طاقت کی جگہ مشینی طاقت سے کام لیتی ہو، صنعت و حرفت اور کاروبار میں استعمال کرنے کی اس وقت تک اجازت نہ دی جائے جب تک اس امر کا اچھی طرح جائزہ نہ لیا جائے کہ وہ کتنے انسانوں کی روزی پر اثر ڈالے گی، اور یہ اطمینان نہ کر لیا جائے کہ ان متاثر ہونے والے لوگوں کی معیشت کا کیا بندوبست ہوگا۔

(۲) اجیروں اور مستاجروں کے درمیان حقوق اور فرائض اور شرائطِ کار کا تفصیلی تعین تو بہر حال فریقین ہی کی باہمی قرارداد پر چھوڑا جائے گا۔ مگر ریاست اس معاملہ میں انصاف کے چند اصول لازماً طے کر دے مثلاً ایک کارکن کے لیے کم سے کم تنخواہ یا مزدوری کا معیار، زیادہ سے زیادہ اوقاتِ کار کی حد، بیماری کی حالت میں علاج کے اور جسمانی نقصان کی صورت میں تلافی کے اور ناقابلِ کار ہو جانے کی حالت میں پنشن کے کم از کم حقوق اور ایسے ہی دُوسرے امور۔

(۳) اجیر و مستاجر کی نزاعات کا تصفیہ حکومت اپنے ذمّہ لے اور اس کے لیے باہمی مفاہمت، ثالثی اور عدالت کا ایک ایسا ضابطہ مقرر کر دے جس کی وجہ سے ہڑتالوں اور دربندیوں (Lock Out) کی نوبت ہی نہ آنے پاتے۔

(۴) کاروبار میں احتکار[1] (Hoarding) سٹے (Speculation) تجارتی قماربازی اور غائب سودوں کی قطعی ممانعت کر دی جائے اور ان تمام طریقوں کو ازروئے قانون بند کیا جائے جن سے قیمتوں پر ایک مصنوعی آماس چڑھتا ہے[2]۔

(۵) پیداوار کو قصداً برباد کرنا جُرم قرار دیا جائے۔

---

[1] یعنی اشیاءِ ضرورت کے ذخائر کو سمیٹ سمیٹ کر فروخت سے روک رکھنا تاکہ ان کی قیمتیں چڑھ جائیں۔

[2] اسلامی شریعت کا تجارتی قانون درحقیقت معاشی زندگی کی اصلاح کا ایک بڑا اہم باب ہے جس سے دنیا نے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ خود مسلمانوں نے بھی اس سے مجرمانہ غفلت برتی ہے۔ یہاں اس قانون کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ انشاءاللہ عنقریب ایک مستقل رسالہ خاص اس موضوع پر مرتب کر دیا جائے گا۔ اس مقام پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ کاروبار کے ان غلط طریقوں کو ازروئے قانون بند ہونا چاہیے جو اجتماعی مفاد کے لیے نقصان دہ ہیں۔

(۶) صنعت اور تجارت کا ہر شعبہ حتی الامکان مسابقت کے لیے کھلا رہے اور اجارہ داریوں سے کسی شخص یا گروہ کو ایسے امتیازی حقوق نہ مل جائیں جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہوں۔

(۷) ایسی صنعتوں اور تجارتوں کی اجازت نہ ہو جو عامۃ الناس کے اخلاق یا صحت پر بُرا اثر ڈالتی ہوں۔ اس طرح کی کوئی چیز اگر کسی پہلو سے ضروری ہو تو اس کی صنعت و تجارت پر تا بحدِ ضرورت پابندیاں عائد کی جائیں۔

(۸) حکومت نارمل طریقہ پر صنعت و تجارت کو بالکل اپنے تسلط (Control) میں تو نہ لے، مگر رہنمائی اور توفیق (Co-ordination) کی خدمت لازماً انجام دیتی رہے تاکہ ملک کی صنعت و تجارت غلط راستوں پر بھی نہ جانے پائے، اور معاشی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی بھی پیدا ہو سکے۔

(۹) اسلامی قانونِ میراث کے ذریعہ سے زمینداروں کی طرح صناعوں اور کاروباری لوگوں کی سمٹی ہوئی دولت بھی پیہم تقسیم ہوتی رہے تاکہ مستقل دولت مند طبقے نہ بننے پائیں۔

(۱۰) اہل زراعت کی طرح تاجروں اور صناعوں اور کاروباری لوگوں سے بھی ان کی آمدنیوں کا اک حصہ ان مقاصد کے لئے لازماً لے لیا جائے جن کا ذکر آگے زکوٰۃ کے زیرِ عنوان آ رہا ہے۔

۳۔ مالیات

مالیات میں اسلام افراد کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ ان کی آمدنیوں کا جو حصہ ان کی ضروریات سے بچ رہے اسے جمع کریں یا دوسروں کو قرض دیں یا خود کسی کاروبار میں لگائیں یا کسی صنعت و تجارت میں اپنا سرمایہ دے کر اس کے نفع و نقصان میں حصہ دار

بن جائیں۔ اگرچہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ تو یہی ہے کہ لوگ اپنی فاضل آمدنیوں کو نیک کاموں میں خرچ کر دیا کریں لیکن وہ مذکورہ بالا طریقوں کو بھی جائز رکھتا ہے بشرطیکہ وہ حسب ذیل قواعد کے پابند ہوں۔

(۱) جمع کرنے کی صورت میں وہ اس جمع شدہ دولت کا ۲ ½ فی صدی سالانہ حصّہ لازماً ان کاموں کے لیے دیتے رہیں جن کا ذکر آگے زکوٰۃ کے زیرِ عنوان آرہا ہے، اور جب وہ مریں تو ان کا پورا سرمایہ اسلامی قانونِ میراث کے مطابق ان کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔

(۲) قرض دینے کی صورت میں وہ صرف اپنا دیا ہوا سرمایہ ہی واپس لے سکتے ہیں۔ کسی حالت میں سُود کے مستحق وہ نہیں ہیں، خواہ قرض لینے والے نے اپنے ذاتی مصارف میں صرف کرنے کے لیے قرض لیا ہو یا کسی صنعت و تجارت میں لگانے کے لیے۔ اسی طرح وہ اس امر کا حق بھی نہیں رکھتے کہ اگر اپنے دیئے ہوئے مال کی واپسی کا اطمینان کرنے کے لیے انہوں نے مدیون سے کوئی زمین یا جائداد رہن کے طور پر لی ہو تو وہ اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھائیں۔ قرض پر فائدہ بہرحال سُود ہے اور وہ کسی شکل میں بھی نہیں لیا جا سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی جائز نہیں ہے کہ نقد خریداری کی صورت میں ایک مال کی قیمت کچھ ہو اور قرض پر خریدنے کی صورت میں اس سے زیادہ ہو۔

(۳) صنعت و تجارت یا زراعت میں براہِ راست خود سرمایہ لگانے کی صورت میں ان کو ان قواعد کا پابند ہونا پڑے گا جو اوپر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کے سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

(۴) حصہ داری کی صورت میں ان کو لازماً نفع اور نقصان میں یکساں شریک ہونا پڑے گا، اور وہ ایک طے شدہ تناسب کے مطابق دونوں میں حصہ دار ہوں گے۔ شرکت کی کوئی ایسی صورت قانوناً جائز نہ ہوگی جس کی رُو سے سرمایہ دینے والا صرف نفع میں شریک ہو، اور مقرر شرح منافع کا لازماً حق دار قرار پائے۔

زکوٰۃ

اسلام معاشرے اور ریاست کے ذمّہ یہ فرض عائد نہیں کرتا کہ وہ اپنے افراد کو روزگار فراہم کرے۔ اس لیے کہ فراہمی روزگار کی ذمّہ داری بغیر اس کے نہیں لی جا سکتی کہ ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ یا کم از کم نازی طرز کا تسلط ہو۔ اور اس کی غلطی و مضرت پہلے بتائی جا چکی ہے۔ لیکن اسلام اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ اجتماعی زندگی میں افراد کو بالکل ان کے اپنے ہی ذرائع اور اپنے ہی حالات پر چھوڑ دیا جائے اور آفت رسیدہ لوگوں کی خبر گیری کا کوئی بھی ذمّہ دار نہ ہو۔ وہ ایک طرف ہر انسان پر فرداً فرداً یہ اخلاقی فریضہ عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے اور پرائے جس فردِ بشر کو بھی مدد کا محتاج پائے اس کی مدد اپنی حدِ استطاعت تک ضرور کرے۔ دُوسری طرف وہ صناعوں، تاجروں اور زمینداروں سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں جن لوگوں سے وہ کام لیتے ہیں ان کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ اور اس سب پر مزید یہ کہ وہ پورے معاشرے اور ریاست پر یہ ذمّہ داری عائد کرتا ہے کہ اس کے حدُودِ عمل کے اندر رہنے والا کوئی شخص کم سے کم ضروریاتِ زندگی سے محرُوم نہ رہنے پائے۔ معاشرے کے اندر جو لوگ بے روزگار ہو جائیں، یا کسی عارضی سبب سے ناقابلِ کار ہوں، یا کسی مستقل وجہ سے ناکارہ ہو جائیں،

یا کسی حادثے اور آفت کے شکار ہوں، ان سب کو سہارا دینا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ وہ بچے جن کا کوئی سرپرست نہیں، ان کی سرپرستی کرنا ریاست کا فرض ہے۔ حد یہ ہے کہ جو شخص قرضدار ہو اور اپنا قرض ادا نہ کر سکے اس کا قرض بھی بالآخر ریاست پر جا پڑتا ہے۔ یہ سوشل انشورنس کی ایک وسیع ترین اسکیم ہے جو براہِ راست ریاست کے انتظام میں روبعمل آنی چاہیے۔ اس کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کا انتظام اسلام حسبِ ذیل طریقہ پر تجویز کرتا ہے:

(۱) ہر شخص جس نے ایک مقررہ حدِ نصاب سے زائد سرمایہ جمع کر رکھا ہو، اپنے سرمایہ کا ۲½ فی صدی حصہ سالانہ زکوٰۃ میں دے۔

(۲) ہر زمیندار و کاشتکار اپنی بارانی زمینوں کی پیداوار کا ۱۰ فی صدی اور چاہی و نہری زمینوں کی پیداوار کا ۵ فی صدی حصہ اس مد میں ادا کرے۔

(۳) ہر صناع اور تاجر ہر سال کے اختتام پر اپنے اموالِ تجارت کی مالیت کا ۲½ فی صدی حصہ دے۔

(۴) ہر گلہ بان جو ایک خاص مقدار نصاب سے زیادہ مویشی رکھتا ہو، ایک خاص تناسب کے مطابق اپنی حیوانی دولت کا ایک حصہ ہر سال حکومت کے حوالہ کر دے۔

(۵) معدنیات اور دفینوں میں سے بھی خمس لیا جائے۔

(۶) اور کوئی جنگ پیش آئے تو اموالِ غنیمت میں سے ۲۰ فیصدی

حصّہ ان اغراض کے لیے الگ کر لینا چاہیے۔

یہ پوری دولت اُن مصارف کے لیے وقف ہوگی جو قرآن مجید میں زکوٰۃ اور خمس کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، جن کا ایک جزوِ اعظم سوشل انشورنس کی وہ اسکیم ہے جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے[1]

۵۔ حکومت کی محدود مداخلت

اسلام اس بات کو اصولاً پسند نہیں کرتا کہ حکومت خود صنّاع یا تاجر یا زمیندار بنے۔ اس کے نزدیک حکومت کا کام رہنمائی ہے، قیامِ عدل ہے، مفاسد کی روک تھام ہے، اور اجتماعی فلاح کی خدمت ہے۔ مگر سیاسی طاقت کے ساتھ سوداگری کو جمع کرنے کی قباحتیں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ اس کے چند ظاہری فوائد کی خاطر ان کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ صرف ایسی صنعتوں اور ایسے کاروبار کو حکومت کے انتظام میں چلانا جائز رکھتا ہے جو قومی زندگی کے لیے ضروری تو ہوں، مگر یا تو افراد انہیں چلانے کے لیے خود تیار نہ ہوں، یا انفرادی ہاتھوں میں ان کا رہنا فی الواقع اجتماعی مفاد کے لیے نقصان دہ ہو۔ اس قسم کے کاموں کے ماسوا دوسرے صنعتی و تجارتی کام اگر ملک کی ترقی و بہبود کی خاطر حکومت خود شروع کرے بھی تو اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ایک خاص حد تک کامیابی کے ساتھ چلانے کے بعد وہ اس

---

[1] زکوٰۃ اور خمس کے جن مسائل کا یہاں اشارہ کیا گیا ہے ان پر تفصیلی معلومات ہماری کتاب رسائل و مسائل حصّہ دوم میں ملیں گی۔

کاروبار کو انفرادی ہاتھوں میں منتقل کردے۔

متوازن معیشت کے چار بنیادی اصول

یہ حدود وضوابط اور یہ اصلاحی تدبیریں اگر معیشت کے ان سات فطری اصولوں کے ساتھ جمع کردی جائیں جو "جدید نظام سرمایہ داری" کے باب میں ہم بیان کرچکے ہیں، تو اس سے جاگیرداری و سرمایہ داری کی تمام خرابیوں کا سدباب ہوجاتا ہے اور ایک ایسا متوازن نظام معیشت بن جاتا ہے جس میں انفرادی آزادی اور اجتماعی فلاح، دونوں ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ سموئے جاسکتے ہیں، بغیر اس کے کہ موجودہ صنعتی انقلاب کی رفتار ترقی میں ذرّہ بھر بھی خلل آنے پائے۔

اس متوازن معیشت کے بنیادی ارکان چار ہیں:

(۱) آزاد معیشت چند قانونی اور انتظامی حدود وقیود کے اندر

(۲) زکوٰۃ کی فرضیت۔

(۳) قانونِ میراث۔

(۴) سُود کی حرمت

ان میں سے پہلے رکن کو کم ازکم اصولی طور پر وہ سب لوگ اب درست تسلیم کرنے لگے ہیں جن کے سامنے بے قید سرمایہ داری کی قباحتیں اور اشتراکیت و فاشیت کی شناعتیں بے نقاب ہوچکی ہیں۔ اس کی تفصیلات کے بارے میں کچھ الجھنیں ذہنوں میں ضرور پائی جاتی ہیں، مگر ہمیں امید ہے کہ جو کچھ اس باب میں ہم نے زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کے زیرِ عنوان بیان کیا ہے

اس کے مطالعہ سے وہ الجھنیں بھی دور ہو جائیں گی اور ہماری کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" بھی انہیں دور کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوگی۔

دوسرے رکن کی اہمیت اب بڑی حد تک دنیا کے سامنے واضح ہو چکی ہے کسی صاحبِ نظر سے یہ بات مخفی نہیں رہی ہے کہ اشتراکیت، فاشزم اور سرمایہ دارانہ جمہوریت، تینوں نے اب تک سوشل انشورنس کا جو وسیع نظام سوچا ہے، زکوٰۃ اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانے پر اجتماعی انشورنس کا انتظام کرتی ہے لیکن یہاں بھی کچھ الجھنیں زکوٰۃ کے تفصیلی احکام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں۔ اور لوگوں کے لیے یہ بات سمجھنی بھی مشکل ہو رہی ہے کہ ایک جدید ریاست کے مالیات میں زکوٰۃ و خمس کو کس طرح نصب کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں ہم توقع رکھتے ہیں کہ "احکامِ زکوٰۃ" پر ہمارا مختصر رسالہ تشفی بخش ثابت ہوگا۔

تیسرے رکن کے بارے میں اسلام نے تمام دنیا کے قوانینِ وراثت سے ہٹ کر جو مسلک اختیار کیا ہے، پہلے اس کی حکمتوں سے بکثرت لوگ ناواقف تھے اور طرح طرح کے اعتراضات اس پر کرتے تھے، لیکن اب بتدریج ساری دنیا اس کی طرف رجوع کرتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ روسی اشتراکیت کو بھی اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے[1]۔

---

[1] سوویٹ روس کے تازہ ترین قانونِ وراثت میں اولاد، بیوی، شوہر، والدین، بھائیوں اور بہنوں اور زندگی کا وارث ٹھیرایا گیا ہے۔ نیز یہ قاعدہ بھی مقرر

مگر اس نقشے کے چوتھے رُکن کو سمجھنے میں موجودہ زمانے کے لوگوں کو سخت مشکل پیش آرہی ہے۔ یورپ زدہ علم معیشت نے پچھلی صدیوں میں یہ تخیل بڑی گہری جڑوں کے ساتھ جما دیا ہے کہ سُود کی حرمت محض ایک جذباتی چیز ہے، اور یہ کہ بلا سُود کسی شخص کو قرض دینا محض ایک اخلاقی رعایت ہے۔ جس کا مطالبہ مذہب نے خواہ مخواہ اس قدر مبالغہ کے ساتھ کر دیا ہے ورنہ منطقی حیثیت سے سُود سراسر ایک معقول چیز ہے اور معاشی حیثیت سے وہ صرف ناقابلِ اعتراض ہی نہیں بلکہ عملاً مفید اور ضروری بھی ہے۔ اس غلط نظریہ اور اس کی اس پُرزور تبلیغ کا اثر یہ ہے کہ جدید نظامِ سرمایہ داری کے تمام عیوب پر تو دنیا بھر کے ناقدین کی نگاہ پڑتی ہے مگر اس سب سے بڑے بنیادی عیب پر کسی کی نگاہ نہیں پڑتی۔ حتیٰ کہ رُوس کے اشتراکی بھی اپنی مملکت میں سرمایہ داری نظام کی اس ام الخبائث کو برطانیہ اور امریکہ ہی کی طرح پرورش کر رہے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ خود مسلمان بھی، جن کو دنیا میں سُود کا سب سے بڑا

کیا گیا ہے کہ آدمی اپنا ترکہ اپنے حاجت مند قریبی رشتہ داروں اور پبلک اداروں میں تقسیم کرنے کی وصیت کر سکتا ہے مگر رشتہ داروں کا حق مقدم ہے، اس کے ساتھ ایسی وصیت ممنوع ٹھیرائی گئی ہے جس کا مقصود نابالغ اولاد یا غریب وارثوں کو حقِ وراثت سے محروم کرنا ہو۔ اس قانون کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اشتراکی "ترقی پسندوں" نے ۱۹۴۵ء میں اس قانون کی طرف "رجعت" فرمائی ہے جو ۶۲۵ء میں بنایا گیا تھا۔

دشمن ہونا چاہیے، مغرب کے اس گمراہ کن پروپیگنڈا سے بُری طرح متاثر ہو چکے ہیں۔ ہمارے شکست خوردہ اہلِ مذہب میں یہ عام غلط فہمی پھیل گئی ہے کہ سُود کوئی قابلِ اعتراض چیز اگر ہے بھی تو صرف اس صورت میں جبکہ وہ ان لوگوں سے وصول کیا جائے جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے قرض لیتے ہیں، رہے وہ قرضے جو کاروبار میں لگانے کے لیے حاصل کیے گئے ہوں، تو ان پر سُود کا لین دین سراسر جائز و معقول اور حلال و طیب ہے، اور اس میں دین، اخلاق، عقل اور اصولِ علمِ معیشت، کسی چیز کے اعتبار سے بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس پر مزید وہ خوش فہمیاں ہیں جن کی بنا پر قدیم طرز کے بنیوں اور ساہوکاروں کی سُود خواری سے موجودہ زمانہ کے بینکنگ کو ایک مختلف چیز سمجھا جاتا ہے۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان بینکوں کا "ستھرا" کاروبار تو بالکل ایک پاکیزہ چیز ہے جس سے ہر قسم کا تعلق رکھا جا سکتا ہے۔ ان تمام مغالطوں کے چکر سے جو لوگ نکل گئے ہیں وہ بھی یہ سمجھنے میں مشکل محسوس کر رہے ہیں کہ سُود کو قانوناً بند کر دینے کے بعد موجودہ زمانہ میں مالیات کا نظم کس طرح قائم ہو سکتا ہے۔ ان مسائل پر ایک مستقل بحث کی ضرورت ہے جس کے لیے اس رسالہ میں گنجائش نہیں ہے۔ میری کتاب "سُود" انہی مسائل کے لیے مختص ہے، اس لیے جو اصحاب ان کے متعلق تشفی چاہتے ہیں وہ اس کا مطالعہ فرمائیں۔